www.KitaboSunnat.com
تحریک آزادی
مولانا ابوالکلام آزاد

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے
In the Name of Allah, Most Gracious, Most Merciful
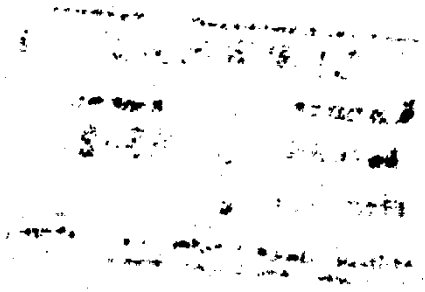
تحریکِ آزادی

مصنف

مولانا ابوالکلام آزادؒ
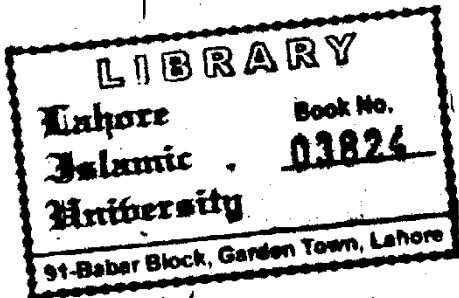
طیب پبلشرز

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

آ ب و ت

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	☆	تحریکِ آزادی
مصنف	☆	مولانا ابوالکلام آزادؒ
مطبع	☆	حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور۔
تعداد	☆	500
اہتمام	☆	محبوب الرحمٰن انور
برائے	☆	طیب پبلشرز لاہور۔7241778
کمپوزنگ	☆	گل گرافکس 7120047
قیمت	☆	=/90 روپے

"کتاب انسان کی بہترین دوست ہے"

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

پیدائش ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ستمبر ۱۸۸۸ء

وفات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء

فہرست

مُسلمان

اگر آزادی کے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ لائیں اور ان کے
ایک جانب چاندی سونے کا ڈھیر ہو اور دوسری جانب فوجوں کی قطاریں کھڑی ہو جائیں۔
پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک وہ خود اپنے اندر ایک مضبوط اور سچی تبدیلی نہ پیدا
کرینگے۔ اور ان تمام گناہوں اور جرموں کے ارتکاب سے باز نہ آ جائیں گے جن کی وجہ
سے یہ تمام مصیبتیں ان کو گھیرے ہوئے ہیں۔

ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

تحریک آزادی اور مسلمان

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا۔ جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا' غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہونگی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کر لیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور زبوں طالع قوم' جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک' ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی' راہ آزادی میں سنگ گراں' حاکمانہ طمع کا کھلونا' دست اجانب میں بازیچۂ لعب' ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک پتھر بن کر رہی!

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا۔ جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔ جس میں کوئی انسانی ارادہ۔ کوئی انسانی دماغ۔ کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو اپنے دماغ سے نہ سوچ سکتا تھا' نہ اپنی آواز سے بول سکتا تھا' نہ اپنے پاؤں سے چل سکتا تھا۔ اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتا تھا۔ ایک معمول جو مسمرائز کے ارادہ پر زندہ ہو۔ ایک وجود شل۔ جو صرف زمین کے لئے بار ہو' ایک درخت جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو۔ ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیئے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانی کی

پیشانی پر ہو۔

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ ثم آہ! کہ "مُسلم" تھی جو اپنے ساتھ انسانی شرف وجلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی۔ جو دنیا میں اس لئے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد واستعباد کی زنجیروں سے بندگان الٰہی کو آزاد کرائے' جو اس لئے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے نہ اس لئے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے' جو اس لئے آئی تھی کہ تمام ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں بھی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دے نہ اس لئے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی' تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا۔ نہ کہ وہ خود خاک و مذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اُس ملّتِ حنیفی کی پیرو تھی جو دنیا میں صرف اس لئے ہے کہ حاکم ہو' نہ اس لئے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی۔ اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے' جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب واقدس میں نہیں ہے۔ جو "مُسلم" تھی۔ اور اس لئے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ :۔

ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا
اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس
کے پیچھے پیچھے ہوتیں۔ کیوں کہ اس کے پاس "اسلام"
تھا اور "اسلام" آگے رہنے کے لئے ہے پیچھے رہنے
کے لئے نہیں۔

وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی وجسمانی نجات پائیں پر وہ کسی کے آگے جھکنے کے محتاج نہیں ہے۔

دماغ سوچنے کے لئے ہے نہ کہ غفلت کے لئے۔ پس تمہارے پاس دماغ ہے تو اے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے۔ میری روح بے چین ہے۔ میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹانکے ہل گئے ہیں۔ اور میرے ہیجان و افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آ گیا ہے۔ یہ کیا ہے کہ میں ایک شے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں۔ لیکن تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ میں سن رہا ہوں پر تم نہیں سنتے؟ آہ! اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا، تم کو کیا کہوں، مجھ کو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے، کہ دین قویم کے پیرو، خطاب اسلام سے متصف اور امانت الٰہی کے حامل ہو، یہ سچ ہے تو تم صرف اس لئے ہوتا کہ نڈر رہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خود مختار ہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو، بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے، اور ملکوں کو بند استبداد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لئے کہ تم جانفروش ہو۔ تاکہ راہِ حق میں سربکف ہو، پھر یہ کیا ہے کہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں، لیکن اے بدبختو! تم ان سے محروم ہو کہ یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشائے عقل سوز ہے۔

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لئے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہو تو تم خاموش ہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بیشک ایک باب ہوگا۔ مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لئے اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھا۔ مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انہوں نے پکارا، مگر انہوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیئے ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لئے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا۔ اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ ملک

کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جارہی تھی اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دیئے جارہے تھے تا کہ وہ دولت جذب کر لے۔ مگر آبپاشی کے لئے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اگلے۔ زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ وفادار ہو' مگر اسلحہ چھونے کی اجازت نہ تھی کہ تم غدار ہو' ملک کی تمام دولت ستّر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جارہی تھی۔ مگر ملتا تو محصول دے کر' اور تعلیم بھی ملتی تو گھر بار بیچ کر۔ پھر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت کے لہجہ میں وعدہ کیا گیا کہ تمیز رنگ و زبان اور امتیاز حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں اور جو راہ اپنے لئے باز ہے' وہی سب کی آمد کی منتظر لیکن جب پاؤں اٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹی کا پتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے' جن میں ملک مبتلا تھا' ہندو اٹھے اور انہوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لئے صرف کر دیا۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لنگڑا لولا بنا دیں۔ جب کہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے۔ تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لئے بیٹھے تھے ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ "وقت نہیں آیا"۔ اور یہ اسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا جس نے جادو کے زور سے ان کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا پس یہ ملک کی ترقی کی راہ میں روک بن کر پڑے تھے۔

اس کے بعد وہ آنے والا مورخ جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا۔ لکھے گا بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی غلام نہیں رہ سکتا تھا۔ اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ تھی۔ چنگیز خاں کا تخت قہر نہ تھا۔ پس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا' اس قوم کی سرفروشی سے

ہوا، جو مسلم نہ تھی، پر جو "مسلم" تھے انہوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سر بلندی کی جگہ سجدۂ مذلت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت وعزت کی یادگار ہے۔ لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کے ترمیم ہوئی۔ نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی۔ فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت خود اختیاری ملی۔ تو صرف ہندوؤں، قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لئے تازیانہ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے کیونکہ انہوں نے پالٹیکس شروع کیا، اور پھر پالٹیکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی، اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے سمجھایا گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لئے روئیں اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں۔ چاندی سونا نہیں۔ لعل وجواہر نہیں بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔

مُسلمانوں کی قربانیاں:

ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے یہ خیال ہے کہ "تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لئے تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو، غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت کی چال تھی؟

سات کروڑ انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے، جب کہ تم اس قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو؟ یاد ہوگا کہ ہم نے ایک بار اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہندوستان میں قدرتی طور پر برٹش گورنمنٹ کو اپنے فوائد کے استحکام کے لئے ایک بڑی قربانی کی ضرورت تھی۔ کہ کوئی ایک قوم ملک کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جائے اور اپنے ملک کی امیدوں کی قربانی کے خون سے اس کے اغراض کے درختوں کو سینچے۔ مسلمانوں نے خود اپنے تئیں اس قربانی کے لئے پیش کر دیا، اور جس بوجھ کے اٹھانے سے ہندوستان کے تمام

قوموں نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے لئے اول روز ہی اپنی گردن پیش کر دی۔

اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عمل السحر نے بند نہ کر دیا ہوتا' تو وہ اس منظر کو دیکھتے اور خون کے آنسو روتے وہ دیکھتے کہ یہ کیا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی وفلاح کا مسئلہ ہی سرے سے "ہندو مسئلہ" ہو گیا ہے اور مسلمانوں کو من حیث القوم اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاؤس آف کامنس میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر "مسئلہ ہند" کے معنی "ہندو مسئلہ" کے ہیں۔ حالانکہ ملک کی ترقی و آزادی کی ذمہ داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی۔ تو اپنے تئیں بھولنے والو تمہارے سر تو خدائے ذوالجلال کی طرف سے تھی' دنیا میں صداقت کے لئے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے۔ پس تم تھے کہ تم کو خدا آگے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو اور پھر اپنے کو بھلایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمہارے لئے جگہ نہیں۔

اکثریت کا خوف:

ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لئے دل سے نکال دیجئے یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا' جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں' بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی قوت ہے۔ جو اس کے اخلاق اس کے کیریکٹر' اس کے اتحاد' اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیت الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے! اسلام کی طاقت کبھی بھی وابستہ دامِ قلت و کثرت نہیں رہی ہے' اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو' وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے۔ یہ تمام وساوس اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں ہے۔ اگر روز اول ہی سے یہی ہو گیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین اعلیٰ کی طرف دیکھنے لگتے' تو اور کسی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور وہ تمام قوتیں جو آج باہمی جدال وقتال میں صرف ہو رہی ہیں' اس کے پیچھے صرف ہوتیں۔

بے توجہی سے نہ سنیئے کہ ایک بہت بڑا نکتۂ عمل کہہ رہا ہوں' اور اپنے طرزِ بیان کا

شا کی ہوں کہ اسرار رموز کی باتیں بھی حسن و عشق کی کہانی بن جاتی ہیں۔ اپنے سامنے ایک جاں ستاں جلوہ گاہ حُسن پیدا کر لیجئے' پھر اگر آپ دوسری طرف دیکھنا چاہیں گے بھی تو نہیں دیکھ سکیں گے' آپ کی تمام بے راہ روی' نفس پرستی اغراض پسندی' باہمی جنگ و جدل' ایثار و فدویت فراموشی اور ہر قسم کی اشغال ضلالت صرف اس لئے ہیں کہ سامنے کشش نہیں' اور جس بلائے عقل و ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں' آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں جس دن ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی ''آزادی'' کے حسن پر پڑ گئی' پھر آپ خود بخود تمام قصے بھول جائیں گے۔

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصب العین اپنے لئے تجویز کرنا چاہیئے۔ مگر مشکلاتِ راہ سے گھبراتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے' نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دہان کو کون بدمزہ کرے؟ لیکن اب ہم ان سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے نیچے اترا ہی نہیں۔ کسی طرح منہ بنا کر ایک جرعہ اتار لیجئے' پھر پوچھیں گے کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

اے اخوان غفلت شعار نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ مقتل سیاست ہے' یہ مشہد آزادی و حریت ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لئے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے' یہ آپ سے کس کمبخت نے کہا ہے کہ خارزار میں قدم رکھیئے؟ یہاں آیئے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے' ہر لحہ مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں۔ حالانکہ یہاں تو جانوروں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے' یہاں ہوس پرستیوں کا گزر نہیں' اس میدان کے مرد وہ جانفروشان الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں۔

سیاست کی جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ چند تجویزیں گھڑ کر اور شکریہ کے سجدے کر کے اپنے عیش کدوں میں چھپ جایئے گا۔ اور وہ آسمان سے ڈھونڈھتی ہوئی آپ کے سامنے آ موجود ہوگی! آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ آیئے۔ لیکن آنے کا ارادہ ہے تو اپنے دل و جگر کے طاقت کو ٹٹول لیجئے۔

غلامی اور سیاست:

آپ کے گزشتہ اعمالِ سیاست سامنے آجاتے ہیں تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ آپ نے برسوں سیاست کے ساتھ جو تمسخر کیا ہے۔ اس کی نظر شاید ہی کسی قوم کی ضلالت و گمراہی میں ملے ہر خوشامد و غلامی کی غلاظت کا کیڑا جس کا وجود اغراض پرستی کی کثافت سے متعفن ہوتا تھا' نکلتا تھا اور دعوی کرتا تھا کہ میں مردِ میدان سیاست ہوں اور قوم کے پولیٹیکل اعمال کا مصلح! جن عیش پرستوں کو کسی آزمائش میں پڑنے کی ہمت ایک طرف' اتنے کی بھی برداشت نہ تھی کہ گورنمنٹ کے چشم وابرو کی ذراسی بے مہری بھی گوارہ ہو' اس کا دعویٰ ہوتا تھا کہ ہم قوم کے پولیٹیکل کارزار اعمال کے سپہ سالار ہیں' اور نکلے ہیں تاکہ اس کے معرکے میں اپنی تلوار کے کاٹ دکھلائیں۔ اربابِ نظران ہوس پرستوں کو دیکھتے تھے ہنستے بھی تھے اور زمانے کی بوالعجبی پر روتے بھی تھے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب ابروئے شیوۂ اہل نظر گئی۔

اے بے خبرو! یاد رکھو کہ زندگی کی خواہش ہے تو مشکلات سے گھبرانا لاحاصل ہے۔ کیونکہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسانوں ہی کے لئے ہیں ایک بے روح لاش کے لئے نہیں ہیں آرام کی خواہش ہے تو اس کی سب سے بہتر جگہ قبر ہے۔ بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی پر جب چلو گے تو ٹھوکریں کھانا ضروری ہیں۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں۔ اب خدا کے لئے بستر مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھئے کہ آفتاب کہاں نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں تک پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولئے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ "مسلم" ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے کب تک اس دین الٰہی کو اپنے اعمال سے شرمندہ کیجئے گا؟ کب تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسائیے گا' اور خود نہ روئیے گا؟ اور کب تک ہندوستان میں اسلام کی قوت کا خانہ خالی رہے گا؟ اگر مصائب کا تازیانہ غفلت کی ہوشیاری کا ذریعہ ہے تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نزول نہیں ہو چکا ہے۔

یاد رکھیئے کہ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے' مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی' اور داخل جہاد فی سبیل اللہ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی ہیں ہر وہ کوشش داخل ہے' جو حق اور صداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کے توڑنے کے لئے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں' یقین کیجئے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف ہیں جس کے لئے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔ پس اٹھ کھڑے ہو کہ خدا تم کو اٹھانا چاہتا ہے' اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہوں بیدار ہوں' اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں' ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔

آخری منزل:

ہم نے آخری منزل کا بار بار ذکر کیا ہے' وہ ہمارے سفر کا مقصود ہے۔ طلب وسعی کا مطلوب ہے۔ جستجو کا سراغ ہے آرزوؤں اور تمناؤں کی امید گاہ ہے! پھر کیا وہ آ گئی؟

اگر واقعی آ گئی ہے اور واقعی ملک اس کے استقبال کے لئے تیار ہے تو ہماری کامیابی بھی آ گئی' اور فتح و مراد نے بھی اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا!

ہم نے اوّل دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کے لئے آخری منزل قید خانہ ہے اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا قید خانوں کی کوٹھڑیوں میں ہوگا۔ ہم نے اسی لئے سول ڈس او بیڈینس یعنی سول قانون کی نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا۔ کیونکہ قید خانہ کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ وہی ہے۔ پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آ گیا ہے۔

سفر دو ہیں' ایک اشخاص کا' ایک مقصد کا' اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں جب انہوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا' تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ اور وہ کامیاب ہو گئے۔ ان کے

لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں؟ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے' اور اسکے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا' اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں ایک ہی ہیں۔

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے۔' جو بیج بوتا ہے' خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروان مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔

ہندوستان نے بھی سفر شروع کیا' ایک سفر اس کے مقاصد کا ہے' ایک سفر جان داد گان مقاصد کے فرائض کا ہے اور پہلے کی کامیابی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہے' طریق عمل یہ قرار پایا کہ جو سفر اس وقت تک چند مسافروں میں محدود تھا۔ اس کو تمام ملک اپنا شیوہ بنا لے اور سینکڑوں اور ہزاروں جانباز ایسے پیدا ہو جائیں جو کامل خود فروشی اور قربانی کے ساتھ کوچ کر دیں۔ ایمان کی لازوال روح ان کے دلوں میں ہو۔ صبر انتھک اور اٹل طاقت ان کے قدموں میں' عشق ان کی رہبری کرے۔ شوق ان کا رفیق ودمساز ہو' عزم قدم قدم پر ہمت بڑھائے' اور ہمت آگے بڑھ کر راہ صاف کرے اور پھر جب آخری منزل آ جائے' قید و بند کی پکار ہو اور طوق وزنجیر استقبال کریں۔ تو ایسا ہو کہ ہزاروں قدم اس کے لئے مضطربانہ دوڑیں ہزاروں ہاتھ اس کے طرف والہانہ بڑھیں' ہزاروں دل اس کے طلب و شوق سے معمور ہو جائیں وہ عیش ونشاط کی پکار ہو۔ کامرانی ومراد کی بخشش ہو۔ فتح واقبال کا نشان ہو۔ ہر انسان اس کے لئے آرزوئیں کرے' ہر دل اس کے لئے رشک کھائے' اور ہر روح میں اس کے لئے بے قراری سما جائے قید کرنے والے قید کرتے کرتے تھک جائیں۔ لیکن قید ہونے والے قید ہونے سے نہ اکتائیں۔ ہتھکڑی پہنانے کے لئے ہاتھ نہ ملیں۔ لیکن ہتھکڑی پہننے والے ہاتھوں کی کمی نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں ایک نئی بستی زندانیان حق کی آباد ہو جائے اور اس کی کوٹھڑیوں اور محنت خانوں میں چوروں اور

ڈاکوؤں کے رکھنے کی جگہ باقی نہ رہے۔

جب ملک قربانی اور سرفروشی کا یہ جذبہ طے کرلے گا تو پھر اس کی طاقت ناقابل تسخیر ہو جائے گی۔ کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کرے گا۔ کوئی فوج اس کو فتح نہ کر سکے گی۔ آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اُتر آئیں اور سمندر کی تمام فوجیں بھی اکٹھی ہو جائیں جب بھی قربانی کی قہرمان طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کو قید کے نام سے دھمکایا جا سکتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے۔ لیکن جو انسان خود قید کا آرزومند ہو اور موت سے بے خوف ہو اس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے؟

بالآخر یا تو گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اترنا ہوگا اور حق وانصاف کے سامنے جھکنا پڑے گا یا ہمیشہ کے لئے اسے تخت ہی چھوڑ دینا پڑے گا۔ لیکن اس منزل کا نقشہ لفظوں میں جس قدر جلد کھنچ گیا۔ عمل میں اس قدر آسان نہیں ہے کہ ایک ایسی حرکت کے لئے جو کروڑوں غفلت پسند انسانوں میں پھیلی ہوئی ہو بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے اور جب تک خود ہمارے دلوں کا کام پورا نہ ہو جائے میدان کا کام شروع نہیں ہو سکتا۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ملک میں کامل قربانی' استقامت اور نظم پیدا ہو جائے قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے خود فروش تیار ہو جائیں جو کاملِ ایمان ویقین کے ساتھ سچائی کے ہاتھ بک چکے ہوں۔

استقامت سے مقصود یہ ہے کہ ان کا جذبہ عارضی وہنگامی نہ ہو بلکہ اس میں پوری طرح قرار و جماؤ پیدا ہو جائے۔ ان کی آگ ہوا سے بھڑکائی جائے لیکن پھر دم بدم ہوا کی محتاج نہ رہے۔ خود چولھے میں بھی مشتعل رہنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ وہ سمندر کی طرح لبریز ہو جائیں۔ پہاڑ کی طرح خود اپنے سہارے کھڑے ہو جائیں۔ قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ کامیابی اور بے خوفی کے فرشتے صرف ان ہی پر اترتے ہیں جو خدا پرستی کے ساتھ استقامت کا جماؤ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔

نظم سب سے بڑی شرط ہے اور وہ آخری بھی ہے اور پہلی بھی ہے' کائنات کا پورا کارخانہ اسی کی طاقت پر چل رہا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ عمل کا تمام حلقہ ایک رشتہ میں منسلک ہو جائے' کوئی کڑی اس سے باہر نہ جانے پائے جو راہ قرار دی جائے سب اسی پر گامزن رہیں اور سارا حلقہ اس انتظام اور یکسانیت کے ساتھ کام کرے۔ گویا سب کے دل اور جذبات ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔

سب سے بڑی چیز یہ ہے نظم لوگوں میں پورا پورا ضبط اور اپنے اوپر قابو پانے کا ملکہ پیدا کر دے' اشتعال ان کو ہلا نہ سکے' اور غیض و غضب ان پر قابو نہ پا سکے۔ وہ وقت پر بھڑک نہ اٹھیں' بے جا جوش میں آ کر اپنا کام فراموش نہ کر دیں۔ قید و بند کے یہی معنی ہیں کہ ہم قید ہوں۔ قربانی و خود فروشی کے یہی معنی ہیں کہ ہم ہر طرح کی تکالیف اور نقصان برداشت کریں۔

پس اگر ایسا ہونے لگا تو اچنبھا کیوں ہو؟ غصہ کیوں آئے؟ انتقام کا ارادہ کیوں کریں؟ کیوں بچنا چاہیں؟ اور کیوں دوسروں کو بچائیں' پیاسا پانی سے نہیں بھاگتا اور مفلس نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ دولت ملنے پر لڑنے لگا ہو۔ اگر ہم واقعی راہ حق میں قید ہوجانے کے لئے تیار ہیں اور سچ مچ ہمارے دل کا یقین یہی ہے کہ اس منزل سے ہو کر کامیابی تک پہونچیں گے تو پھر ہمارا مطلوب و مقصود یہی ہونا چاہیئے۔ اور اگر مقصود ملنے کی راہ کھل گئی تو ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینا چاہیئے۔ ایسا کیوں ہو کہ ہم بھاگیں اور بے قابو ہو کر لڑنے پر اتر آئیں؟

یہ شرط سب سے بڑی اور نازک شرط ہے اور اس عمل کی ساری کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ اگر یہ طاقت ملک میں پیدا نہ ہوئی تو پھر اس کی قربانی اور استقامت کچھ بھی سودمند نہ ہوگی۔ فوج کتنی ہی بہادر اور جانباز ہو۔ لیکن اگر اس میں نظم واستطاعت نہیں ہے تو اس کی شجاعت و جانبازی یک قلم رائیگاں ہو جائے گا۔ کم از کم ملک میں بکثرت ایسے کارکن مہیا ہو جانے چاہئیں جو وقت پر لوگوں کے جذبات مسخر کر سکیں اور اشتعال اور بے راہ روی پر پوری طرح قابو پالیں۔

ہم اپنی کمزوریوں کا اقرار کرتے رہے ہیں۔ ہم معترف ہیں کہ ملک نے ابھی یہ شرطیں پوری نہیں کیں۔ بلاشبہ قربانی کا ولولہ زندہ ہوگیا ہے۔ لیکن استقامت کا امتحان باقی ہے۔ اور نظم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا' چونکہ ہم مطمئن نہ تھے اس لئے آخری منزل کا اعلان نہ کر سکے اور بار بار ملک سے یہی درخواست کی' کہ درمیانی منزلوں کو پہلے کامیابی کے ساتھ طے کرے۔

کانپور کا دردناک واقعہ:

زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہیئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے' مغرب اقصےٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے' ایران میں کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی' سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے۔؟ مسلمانوں کا' ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے' خون چاہتی' کس کا؟ مسلمانوں کا' آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا' اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش وخروش میں ہے۔ اپنی قربان گاہ کے لئے نذر مانگتی ہے۔ کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے۔ صوبہ متحدہ کا بادشاہ (سر جیمس سٹن) بالآخر بادشاہ آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا۔ جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی!

مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا'

وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہتی تھی وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے، لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ تو تند و تیز ہوا کو روک دیتا ہے تو غیض و غضب کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ کیا تو ہمارے شدائد و مصائب کا طوفان نہیں روک سکتا۔ کیا تو ہمارے حزن و غم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا؟

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا اس سے بھی کم، جتنا ایک راستے کی زینت و آرائش کا؟

۳ اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے۔ بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف و ناتواں وغیرہ مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانوی عدل و انصاف کو زخمی کر رہی ہے؟ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے؟ وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں، نادانو! تم اس سے عداوت کر رہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔

مسلمانوں کی خونریزی:

وہ کیا منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانوی رعایا برہنہ سر برہنہ پا، باچشم و نم و بادل پرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بیکسی کا نشان تھا کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ، چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی۔ جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم اسمٰعیلؑ کی زبان پر جاری تھی۔

یہ پر اثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا۔ کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوجاتی ہے

اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر
گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب
چاک ہوجاتا ہے میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی
لاشیں نظر آتی ہیں۔ جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں
جوافسوس دم توڑ چکیں۔

گورنمنٹ پریس کا فرشتہ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں ۱۴۔لاشیں تھیں پھر بتایا ہے ۱۸ تھیں۔عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل وحجت کو کیونکر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں ۱۰۔۱۵ ہزار آدمیوں کا مجمع ہے پولیس بے تحاشا ۱۰ منٹ تک بے پروائی سے ان پر گولیاں برساتی ہے' ہر گولی ایک دور کے فاصلے تک پھیلتی ہے اور صرف ۱۸ لاشیں ان کے صدمہ سے گر پڑتی ہیں۔ سلمان اپنی روئیں تنی کا دعوی کرتے ہیں۔ان کو مسرور ہونا چاہیئے کہ گورنمنٹ پریس بھی ان کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہے۔

حکومت قانون کے ماتحت ہے۔لیکن افسوس ہم زبان کے ماتحت ہیں۔ہم پر گورنمنٹ کا قانون جو حکومت نہیں کرتا۔ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہے۔ایک ضعیف وکمزور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلۂ ضرر نہیں۔جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا' جو کسی جائیدادوعزت پر حملہ نہیں کرتا۔صرف ایک جنبش لب سے آغشتہ نجاک وخوں ہو جاتا ہے۔

بے شبہ وہ قانون کی مخالفت کرتا تھا۔لیکن اس کی تادیب کیلئے عدالت کے کمرے اور قید خانوں کی کوٹھڑیاں تھیں۔سنگین کی نوکیں' اور بندوقوں کی گولیاں نہ تھیں۔برٹش مورخ ہم کو بتا سکتا ہے کہ برسٹل اور منچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں آتشباز ہتھیاروں سے کام لیا گیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دے گا کہ برسٹل اور کانپور میں کتنی مسافت ہے؟ لیکن اے معصوم مُورخ! برائے خدا ہمیں بتانا کہ برسٹل اور کانپور کی ذی روح حقیقتوں میں کتنا فصل ہے؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں۔لیکن اے

مقدس نصرانی! پیغمبر ناصرہ کے لئے بتانا کیا تیرا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں روح نہیں، ہاں روح ہے لیکن تو نے ان کو بے جان کر دیا۔ کیا تجھ کو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ تو "خون مت کر"۔

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہے کہ "معاملۂ انہدام مسجد کیلئے مسلمانانِ کانپور میں کوئی جوش نہیں صرف بیرونی مسلمان کو جوش ہے" واقعہ قتلِ عام سے پہلے بھی یہ غلط تھا، کہ اگر یہ سچ تھا۔ تو مسلح سپاہی وقت انہدام مسجد کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبت ناک نظاروں سے کن کن کو ڈرایا جا رہا تھا۔؟ اور اب تو حکومت صوبہ متحدہ کو خود نظر آ رہا ہوگا کہ لوازم تدبر و سیاست سے اس خزینہ حکومت قدر تہی تھا۔

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہے کہ مسلمانانِ کانپور کا جوش جرائد اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو طعنہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے جوش و غیرت کی حقیقت صرف چند الفاظ ہیں؟ صوبہ کا نیم سرکاری اخبار "پایونیر" اور پھر وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کا جوالا نگاہ صرف قلم کا میدان ہے۔ شہنشاہی انگلستان کی نیم سرکاری زبان "ٹائمز"۔

سر جیمس مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا، اور ان کے اس جوش دینی اور ولولۂ اسلامی کو جھوٹا کہا جو ۱۳۰۰ برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا۔ انہوں نے اُن زیر خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن رہے سر جیمس مسٹن کے یقین کیلئے دلیل چاہیئے تھی۔ فرزندان اسلام بڑھے اور انہوں نے مقتل عام میں جا کر جسمانی پردہ جو فرمانروائے صوبہ کے سامنے حائل تھا، اُلٹ دیا، اور دنیا کو نظر آ گیا کہ درحقیقت اس پردہ کے پیچھے سرخ انگارے تھے جو خود دوسروں کو نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا۔

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لئے کسی اور دلیل کے طالب ہیں۔ اگر حقیقت میں ان کی طلب صادق ہے اور ان کی کوشش کامل ہے، تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے جو اسیران مدافعت ملی کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں۔ انہیں خبردار رہنا چاہیئے کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی

جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبہ متحدہ کا طرز حکومت اسی وقت ایک خونیں منظر کا اشارہ کر رہا تھا' جب اس کا فرمانروا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی گڑھ) میں اور دوسری طرف مقامی دربار (گورکھپور) میں ایک اسپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی' کہ "بزور اس جوش کو فرو کروں گا"۔ آخر ۳ اگست کو اس وقت جب کہ وہ بریلی میں تھا اور ایک مسلمان ریاست (رامپور) اس کا خیر مقدم کر رہی تھی اس نے بزور اس جوش کو فرو کر دیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے' کہ یہ ان کی خصوصیت ملی ہے۔ ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ مسجد خلیل کی بقائے حرمت کے لئے سر بکف ہیں۔ لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی۔ ان سے وہ خود تو مجروح نہیں ہو گئی؟

شہدائے کانپور کی یاد ہمارے دل میں ہر وقت تازہ رہے گی۔ ہم ان کی برسی منائیں گے' ہم ان کا مرثیہ پڑھیں گے' ہم ان کی مظلومی و بے کسی کو ہر وقت یاد رکھیں گے' ہم ان کے جوش حمایت دینی و مدافعت ملی کو روئیں گے۔ ہم آئندہ سے ۳ اگست کی صبح کو ۱۰ محرم کو دوپہر سمجھیں گے کہ یہ ہماری مظلومیت کی پہلی قسط تھی۔

۴ اگست کی صبح کو ہز آنر لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ اسپیشل ٹرین سے کانپور پہنچ کر پہلے قتل گاہ تشریف لائے جہاں انہوں نے دیکھا ہو گا کہ صرف انسانی ضد اور غلط کاری نے جو گورنمنٹ کے منشاء قانون کے بالکل غیر مطابق تھی۔ اس دیوار کے نیچے جہاں چند روز پہلے تیشوں نے ایک معبد اسلام کی بے حرمتی کی تھی۔ پرستاران دین حنیف ایک ایک اینٹ کو اپنے خون کا سرخ کفن پہنا رہے تھے کہ اسکی ہر اینٹ دین توحید کی ایک سرد لاش تھی۔ انہوں نے اپنی گرم خون کے چھینٹے دیئے کہ ان بے جان لاشوں میں حرکت پیدا ہو' حرکت پیدا ہوئی اور اس نے تمام ہندوستان کو لرزا دیا۔

ہندوستان لرزتا ہے کون ہے جو اُس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو؟

مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے۔ ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے؟ لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہ ملا گولیوں اور بندوقوں کے قطع و برید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ غزوۂ بنی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں۔ ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اخفائے راز کے لئے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھالیا کہ رضوان الٰہی ان کا منتظر تھا۔

مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں! نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے؟ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں گھونپی گئی ہیں؟ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا؟ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا' جس کے بعد بنوامیہ کی تاریخ کا ورق اُلٹ گیا۔

معصوم بچو! اور ریاض اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا؟ سر جیمس مسٹن کے الفاظ طعن نے تمہیں بے گناہ و ناآشنائے جُرم دلوں کو مضطرب کر دیا تم بڑھے کہ اپنے دہن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرواے طائران قدس! اڑ جا کہ عرش کہ سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبارات کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لئے تنبیہ و عبرت نہ تھی' قدرت نے خون کی سُرخ تحریروں میں ہمیں نامہ عبرت دستور تنبیہ بھیجا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اس سے تنبیہ و عبرت حاصل کی۔

کانپور کا واقعہ کانپور کا نہیں رہا۔ بلکہ وہ دنیائے اسلام کا واقعہ ہے۔ مسلمانان عالم نے ہر گوشہ سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کی آغشتہ خون اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا! ہم شرمندہ تھے کہ ہمارے پاس ان کے تحفہ کے لئے جو سامان تھا' ان میں خون کے قطرے نہ تھے' اب ہم شرمندہ نہیں۔ اے مسلمانان عالم! ہمارے بہے ہوئے خون' کٹی ہوئی رگوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا ہدیہ قبول کرو۔

قتل و غارت کا ہولناک منظر:

موت اور ہلاکت کے وہ اوقاتِ الیمہ جو خون کی رگوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سے انسان کی جانوں کو کھینچ لیتے ہیں اور آبادیاں اجاڑ اور زندگیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ وہ ارواح حروب قتال جو زندگی کے لئے موت کا اور آبادی کے لئے ویرانی کا دروازہ ایسی عجلت اور ایسی آسانی سے کھول دیتی ہیں گویا کسی لپٹے ہوئے بند کو کھول دیا گیا۔ وہ ہلاکت اور موت کی عظیم الشان ہستیاں جن پر انسان پاش توپیں لدی ہوئی ہیں اور آگ اور خون کے خونخوار درندے سوار ہیں اور جو سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لیجانا چاہتی ہیں تاکہ اپنے اپنے شکون امور کی تدبیر کریں۔ ان سب کی چھائی ہوئی ہیبت پھیلی ہوئی وحشت کی قسم' اور سب کی پھیلائی ہوئی موت اور برسائی ہوئی ہلاکت کی گواہی' کہ ارضِ الٰہی کا امن ڈوب گیا' انسانیت کی بستی اجاڑ ہو گئی' نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا' اور دنیا ایسی بیوہ کے ہو گئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا ہو اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو' اب وہ اپنے لٹے ہوئے سنگار پر ماتم کرے گی۔ اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دیگی۔ کیوں کہ اس کا حُسن زخمی ہو گیا۔ کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا اور سلئے کہ اُسکے فرزندوں نے اس پر تلوار اٹھائی اور اس لئے کہ دوستوں نے اسے کچل دیا۔ پس زندگی کی جگہ موت عیش و سلامتی کی جگہ اضطراب' نغمہ نشاط کی جگہ شور ماتم' زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی' آبِ زندگی کی جگہ بحر خونیں' بستیوں کی جگہ قبریں اور زندگی کی کاروبار' اور بازاروں کی چہل پہل کی جگہ موت کے وہ جنگل جن میں لاشیں سڑیں گی۔ اور ہولناک سمندروں کے وہ خونی

طوفان جن میں انسان کی لاشیں مچھلیوں کی طرح اچھلیں گی اور اے دنیا کے بڑے بڑے مغرور شہروں کے بسنے والو! کل تک تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا! تاکہ زندگی پر گھمنڈ اور طاقت پر مغرور ہو پر آج تم موت کے کھلونے ہو جنہیں بگاڑ دیا جائے گا۔ اور ہلاکت کی مورتیں ہو جنہیں مٹا دیا جائے گا' اور پھر اے کہ وہ تمدن کی بہشت' علم کے مرغزار اور عیش و نشاط زندگی کے حیرت آباد اور اعجوبہ زار تھے۔ تم کل تک دوسروں کی موت و ہلاکت کی خبریں سنتے تھے پر آج تمہاری ہلاکت کی خبریں پڑھی جائیں گی۔ کل تک تمہارے پاس کرہ ارضی کی مصیبتوں کا قلم تھا۔ پر آج تمہاری مصیبتوں کی تاریخیں مدون ہوں گی تم کل تک دوسروں پر ظلم وقہر کرتے تھے پر آج تم پر ظلم کیا جائے گا۔ تم کل تک دوسروں کے لئے آگ سلگاتے تھے' پر آج تمہارے لئے جہنم بھڑک رہی ہے۔ تم کل تک ضعیفوں اور ناتوانوں کیلئے درندے تھے' پر آج درندوں میں خود چل گئی اور بھیڑیوں نے آپس میں ایک دوسرے پر پنجہ مارا۔ تم کل تک دنیا کے لئے موت کی بجلی اور ہلاکت کی بدلی تھے' پر آج کوئی نہیں جو تمہیں ہلاکت کی بارش اور بربادی کے رعد و برق سے بچا سکے۔ کل مشرق کی بربادیوں کا تم نے تماشا دیکھا' آج وہ تمہاری ہلاکت کو دیکھ رہا ہے۔

انسان کی سوئی ہوئی سبعیت و بہیمیت پھر جاگ اٹھی ہے وہ اشرف المخلوقات کی صورت میں آدمی مگر خواہشوں میں بھیڑیا' محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات۔ مگر اپنی روح بہیمی میں دنیا کا سب سے زیادہ خونخوار جانور ہے' اب اپنی خونریزی کی انتہائی شکل اور اپنی مردم خوری کے سب بُرے وقت میں آ گیا ہے وہ کل تک اپنی کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا۔ پر آج چیتے کی کھال اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیئے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ نیک ہیں۔ درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن اور راحت ملے گی مگر اب انسانوں کی بستیاں اور اولاد آدم کی آبادیاں راحت کے سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہوگئی ہیں' کیونکہ وہ جو خدا کی زمین پر

سب سے اچھا اور سب سے بڑھ کر تھا۔ اگر سب سے برا اور سب سے کم تر ہو جائے تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی اور نیک نہ تھا' ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی برا بھی نہیں ہو سکتا۔

شیر خونخوار ہے' مگر غیروں کے لئے۔ سانپ
زہریلا ہے مگر دوسروں کے لئے۔ چیتا درندہ ہے
مگر اپنے سے کمتر جانوروں کیلئے۔ لیکن انسان
دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق' خود اپنے ہی ہمجنسوں کا
خون بہاتا ہے اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لئے
درندۂ خونخوار ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر خسران ونقصان کیا ہوگا جس میں آج دنیا مبتلا ہے' وہ دنیا جس نے قوتوں کی صیقل کی' جس نے فطرت کے قوانین مستورہ کے بے نقاب کیا۔ جس نے عقل وادراک کے خزانے کھلوا دیئے' جس نے ارتقائے فکر وعلوئے مدرکہ سے دنیا کو علم کا گھر اور دریافتوں اور تحقیقوں کی مملکت بنا دیا' جو علم ومدنیت کے انتہائے عروج سے متوالی ہوگئی۔ جو قوتوں کے حصول کے نشہ سے بدمست ہو کر مغرورانہ جھومنے لگی۔ جس نے کہا کہ انسان کے سوا کچھ نہیں اور جس نے اعلان کیا کہ مادہ کے اوپر کوئی نہیں۔ کیا آج اس کا یہ علم اعلیٰ یہ مدنیت عظمیٰ' یہ ایجادوں کا ڈھیر' یہ مخترعات کا انبار' یہ بے شمار کتابوں کی جلدیں اور یہ لاتعداد لاتحصیٰ' دماغوں کے افکار عالیہ ومدنیہ' ایک لمحہ' ایک دقیقہ کے لئے بھی ایک ہولناک بربادی' اس خوفناک تصادم' اس وحشت انگیز خونخواری' اس خون کا سمندر بہانے والی اور لاشوں سے جنگلوں کو بھر دینے والی جنگ کو روک سکتے ہیں اور نوعِ انسان کو عالم گیر نقصان اور ہلاکت سے بچا سکتے ہیں؟ کیا قانون کشش ثقل جس پر نئے علم کو ناز ہے اس سے بچا لے گا؟ کیا قوت برقی کا کشف اسے روک دے گا؟ کیا بھاپ اور اسٹیم کی ایجاد کچھ سفارش کر سکے گی اور انسان کو غمگینی سے بچا لے گی؟ آہ یہ ایجادات محیرہ' یہ مخترعات مدہشیہ' یہ محدثات منورہ جس پر مدنیت کو ناز ہے اور علم انسانی کو غرہ ہے۔ امن وسلامتی کی جگہ خود ہی ہلاکت اور بربادی کا

وسیلۂ اور خون اور آگ کی افزائش و تضائف کا ذریعہ ہیں۔ اگر پہلے دنیا کے لئے صرف کمان کا تیر اور تلوار کی دھار تھی تو آج تمدن کی بدولت ایک سیکنڈ میں کئی کئی مرتبہ چھوٹنے والے ہلاکت بار گولے اور لمحوں اور منٹوں کے اندر شہروں اور قلعوں کو مسمار کر دینے والے آہن پوش جہاز ہیں۔ پھر اے علم و مدنیۃ کے شیطان کیا تو اس لئے آیا تھا کہ خدا کی آبادی کی ویرانی کو دوگنا اور اس کے ہلاکت کے آلات کو زیادہ مہلک اور لاعلاج بنا دے؟ اور اے انسان کی غفلت اور اے اولادِ آدم کی نادانی! تو کب تک خدا سے لڑے گی، اور کب تک اس کی زمین کے امن و راحت کو روکے گی؟ حالانکہ تمدن اور علم تجھے قوی بنا سکتا ہے پر نیک نہیں بنا سکتا؟

> اور دیکھ یہ کیسی آگ ہے جو بھڑک اٹھی ہے اور کس طرح تمدن کی حسین و جمیل آبادیاں آگ اور دھوئیں کی ہولناکی کے اندر ویران ہو رہی ہیں۔

یہ دنیا کی معذور اور فتحمند طاقتوں کی ٹکر ہے۔ اور اتنی بڑی انسانی درندوں کی لڑائی جتنے بڑے خونخوار اسباع و بہائم آج تک کرہ ارضی پر پیدا نہیں ہوئے دنیا نے ٹیٹس کے قصے سنے ہیں جس نے :۔

> پروشلم کو تباہ کر دیا۔ دنیا نے بخت نصر کو دیکھا ہے جو بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے بابل لے گیا' دنیا میں ایرانیوں قہر و استیلا کے افسانے سنے گئے ہیں' جنہوں نے بابل کو مسمار کر دیا تھا اور رومیوں کے عہد و تسلط و عروج کے ایسے بہت سے فاتح خونریزوں کی روایتیں محفوظ رکھی گئیں ہیں۔ جنہوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقوں کو بہت ستایا اور اس کی زمین پر بہت فساد کیا۔

لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی اشد شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں، مگر نہ تو ایسی درنگی آج تک کسی میں تھی۔ جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا، جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے نگلنے، اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں، پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرور طاقت سے جھوم رہی ہے اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں۔ اس بھیڑیئے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے چیختا ہوا اٹھا ہے اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لا مارک اور روسوں کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لیے پلا ہے! یہ کیسے مہیب ہیں؟ خوفناک آلات سے مسلح ہیں؟ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارضی کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا؟ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا۔ ایسا طوفان جو کبھی بھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک کبھی بھی زمین پر نہ ہوا۔

متمدن قوموں کا غرور حد تک پہنچ چکا ہے، طاقتوں اور عجیب عجیب ترقیوں نے انہیں متوالا کر دیا، ان کو حب سُعن الیہ زمین کی حفاظت کا سبق دیا گیا۔ لیکن انہوں نے قوت پا کر جنگ و فساد کی راہ اختیار کی اور طغیان عصیان سے ارض الٰہی کو بھر دیا۔

پس ضرور تھا کہ غرور و طغیان کے لئے کوئی ہوتی، عجب نہیں کہ مہلت ختم ہوگئی ہو اور اچھا نہیں اگر ارض الٰہی کے امن کے لئے بندگان خدا کی راحت کے لئے اور کمزوروں کو سکھ کی نیند سلانے کے لئے ان کو خون انہی کے ہاتھوں بہایا اور اس طرح عدالت الٰہی اور قوتوں کا حساب لے جو صدیوں سے تمام دنیا کے اعمال کا حساب لے رہے ہیں۔

یوپ کا تمدن، اس کی طاقت، اس کا جنگی اقتدار، اس کے عجیب عجیب اسلحہ، اور برباد کن ہولناکیاں، اس کے مہیب جہاز، اور کئی کروڑ تک پہنچ جانے والی متحدہ فوج، ایسی قاہرد

جابر تھی کہ ان کی تنبیہ کے لئے خود انہی کے سوا اور نہیں ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اپنے سوا ہر قوت کو پامال کیا اور اپنے سوا اور کچھ رہنے نہ دیا۔ پس کون تھا۔ جو ان کے مقابلے میں نکلتا' اور دنیا میں کس کا ہاتھ اتنا قوی تھا' جو ان کے آہنی پنجوں پر پڑتا؟ وہ کہ سب سے بڑے ہو گئے تھے' اُن کے لئے وہ لوگ کیا کام دے سکتے تھے جو آج سب سے چھوٹے ہو گئے ہیں' ان کے جہازوں کے مقابلے کے لئے ان کے جہازوں سے بڑھ کر جہاز چاہئیں تھے' مگر وہ کہاں بنتے؟ ان کی توپوں کے لئے ان کی توپوں سے زیادہ ہلاکت بار توپیں درکار تھیں؟ مگر وہ کہاں ڈھلتیں؟

پس جب زمین پر ان سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا۔ جس کے اندر خدا کا ہاتھ ہوتا دیکھو کہ حکمت الٰہی نے کس طرح خود انہی کو مسلط کر دیا' اور اس کی یہ تدبیر کی کہ باہمی جنگ و قتال میں مبتلا ہو گئے اب ان کو ہولناک تمدن جس کو ایک ہزار سال کے اندر انہوں نے تیار کیا تھا۔

انہیں کی تخریب میں کام آیا۔ اور ان کی ہر ترقی اور ہر بڑائی خود انہی کے لئے وسیلۂ تعذیب ہو گئی۔ اگر ان کی توپوں سے بڑھ کر دوسروں کے پاس توپیں نہ تھیں' تو انہی کی توپوں کے گولے ان کے لئے اڑنے لگے۔ اگر ان سے بڑھکر جنگی جہاز دوسروں کے پاس نہ تھے تو وہی جہاز ان کے مقابلے کے لئے سمندر میں تیرنے لگے۔ ہر پتھر جو انہوں نے اٹھایا' خود انہی کے لئے اڑا' اور ہر آلہ جو انہوں نے تیار کیا وہ انہی کے لئے متحرک ہوا' انہوں نے بڑا سامان کیا تھا۔ مگر خدا کا سامان سب سے بڑا ہے۔

اِنَّھُمۡ یَکِیۡدُوۡنَ	یہ لوگ اپنا داؤ کر رہے
کَیۡدًا وَّاَکِیۡدُ کَیۡدًا	تھے اور ہم اپنا داؤ کھیل رہے
فَمَھِّلِ الۡکٰفِرِیۡنَ	ہیں۔ بس منکروں کو مہلت لینے
اَمۡھِلۡھُمۡ رُوَیۡدًا	دو زیادہ نہیں تھوڑی سی۔

اسلام اور بیوروکریسی:

میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا۔ جو شخصی ہو' یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو' وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے۔ جو نوع انسانی کو اس کی چھنی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا تھا' یہ آزادی بادشاہوں' اجنبی حکومتوں' خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی کو روا نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالا دستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیئے' اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں' نسل' قومیت' رنگ' معیار فضیلت نہیں ہے' بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام سب سے اچھے ہوں۔

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ ! اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی وَجَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَاللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ!

(سورۂ حجرات)

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا' یہ صرف اعلان ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں "اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا" پیغمبر اسلام اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی۔ اور

صرف قوم کے رائے' نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لئے موجود ہیں' شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے "پادشاہ" کے اقتدار و شخصیت سے انکار کیا ہے اور صرف ایک رئیس جمہوریہ (پریذیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا۔ جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظام حکومت کے لئے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا:۔

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾

چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن میں موجود ہے "شوریٰ" کے معنی باہم مشورہ کے ہیں۔ یعنی جو کام کیا جائے' جماعت کی باہم رائے اور مشورہ سے کیا جائے۔ شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لئے کیا ہو سکتا ہے۔

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے بالکل ایسی ہی بات ہے' جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے۔ کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے سے اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ (اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں) ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح (ہر مسلمان کا وظیفہ بھی ڈیوٹی ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے' ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے) علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعے اعلان حق کو روکا جائے۔ تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر

ہو جاتا ہے کیوں کہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے اور "دو اور دو" کو اس لئے "چار" نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لئے خطرے میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لئے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے! وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے صرف اس لئے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی!

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر "شاہد" ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ بحیثیت ایک قوم کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے اور یہی ان کی قومی خصلت (نیشنل کیریکٹر) جو ان کو تمام پچھلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا' تم خدا کی زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو۔ پس ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے اس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

اگر وہ باز رہے' تو یہ قرآن کی اصطلاح میں ''کتمان شہادت'' ہے یعنی گواہی کو چھپانا۔ قرآن میں ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے اور بار بار کہا ہے کہ اسی کتمان شہادت کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں برباد و ہلاک ہو گئیں:۔

اسی لئے اسلام کی واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' ہے۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدۂ توحید کے بعد جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان میں سے ایک کام یہ ہے۔ (قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے۔ وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اس لئے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو روکتے ہیں) اگر وہ ایسا نہ کریں تو اپنی ساری بڑائی کھو دیں۔

(قرآن سچے مسلمان کی پہچان یہ بتلاتا ہے)"وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ دنیا کا کوئی لالچ ان پر غالب آ سکتا ہے اور نہ کوئی خوف وطمع بھی رکھتے ہیں تو صرف خدا سے اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے۔"

پیغمبر اسلام کے بے شمار قولوں میں سی ایک قول یہ ہے "نیکی کا اعلان کرو برائی کو روکو۔ اگر نہ کرو گے تو ایسا ہوگا کہ نہایت ہی بُرے لوگ تم پر حاکم ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب تمہیں گھیر لے گا۔ تم دعائیں مانگو گے کہ یہ حاکم ٹل جائیں۔ مگر قبول نہ ہوگی" (ترمذی وطبرانی عن حذیفہ وعمرؓ)

لیکن یہ فرض کیوں کر انجام دیا جائے؟ اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین مختلف درجے بتلائے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے فرمایا" تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے تو چاہیئے اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اعلان کر لے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے۔ لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے (مسلم) ہندوستان میں ہمیں یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے گورنمنٹ کی برائیاں دور کر دیں اس لئے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کیا جس کی استطاعت حاصل ہے۔ یعنی زبان سے اعلان کرتے ہیں۔

قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے اور بتلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہیں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ ایمان، عمل صالح، توصیۂ حق، توصیہ صبر۔

"توصیۂ حق" کے معنی ہیں ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں اس لئے حق کے ساتھ صبر کی وصیت بھی ضروری تھی، تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے لئے ہر حق گو تیار ہو جائے۔

(اسلام کی بنیاد وعقیدہ "توحید" پر ہے) اور "توحید" کی ضد "شرک" ہے جس سے بیزاری اور نفرت ہر مسلمان کی فطرت میں داخل کی گئی ہے) توحید سے مقصود یہ ہے کہ

خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا (پس سچائی کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی ایک مسلمان زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھلاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کے لئے صرف خدا ہی کی عظمت و جبروت ہے اس کے سوا کوئی نہیں جس سے ڈرنا چاہیئے یا جس کے آگے جھکنا چاہیئے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا، خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا اور اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حقدار ماننا ہے۔ یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

اسی لئے اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جا بجا کہتا ہے" مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے، ہر حال میں سچی بات کہے" (وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ) پیغمبر اسلام نے فرمایا" سب سے بہتر موت اس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کے پاداش میں قتل کیا جائے" (ابوداؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد و قرار لیتے تھے۔ تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا:۔

"میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا۔
خواہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں"
(بخاری و مسلم)

اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لئے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے اسلام کے عالموں، پیشواؤں، بزرگوں، مصنفوں کے تراجم تمام تر اسی قربانی کی سرگزشت ہیں۔

(جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کر لیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں ان کے لئے دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈروانی چیز انہیں ہو سکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے!

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو

کچھ کر رہے ہیں، وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لئے ہمیں بتلایا گیا تھا، نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرف کے مقابلے میں اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کے سمجھتے تو نہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگزر کی حد ہوگئی ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کو برطانیہ کے لئے نہیں چھوڑ سکتے!

اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلے میں دو طرح کے طرز عمل کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں ایک ظلم اجنبی قبضہ و تسلط کا ہے۔ ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے۔ پہلے کے لئے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے دوسرے کے لئے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے۔ لیکن "امر بالعروف" اور "اعلان حق" جس قدر بھی امکان میں ہو، ہر مسلمان کرتا رہے، پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا، دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنا چاہئیں۔ اور دونوں کا نتیجہ کامیابی و فتح مندی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں۔ اجنبیوں کے مقابلہ میں سرفروشی بھی کی، اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھلائی پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی "جنگی جدوجہد" کوئی مثال نہیں رکھتی اسی طرح دوسری صورت میں ان کی "شہری جدوجہد" بھی عدیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے حالانکہ مقابلہ ان کا پہلی حالت سے ہے۔ ان کے لئے جنگی جدوجہد کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن انہوں نے "شہری جدوجہد" کو اختیار کیا۔ انہوں نے "نان وائلنس" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہیں کریں گے۔ یعنی صرف وہی کریں گے۔ جو انہیں مسلمان حکومتوں کے مقابلہ میں کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ اس طرز عمل میں ہندوستان کی ایک طرح کی حالت کو بھی دخل ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیئے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہوگئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں جو انہیں

اپنوں کے مقابلے میں کرنی تھی۔

میں سچ کہتا ہوں مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لئے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے' یہ بات تو بہر حال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لئے بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لئے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلایا جائیگا!

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے' وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے' کہ حکمران ظالم ہے! یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانہ کا ہے۔ جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴ الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو!

میں اس دردانگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ :۔

> اس انقلاب حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں انہوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیئے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لئے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لئے کوئی فتنہ نہیں جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں!

لیکن انسانوں کی بدعملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کتاب میں موجود ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ (مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے۔ یا آزاد رہنا چاہیئے) تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

اسی لئے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جانفروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بیکار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کرلیا ہے کہ:۔

اپنے ہندو ' سکھ ' عیسائی ' پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔

یہ مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کی آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری ۱۸ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہد شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا میں اس کی خاطر چار سال نظر بند رہا۔ مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح و شام اس کی تعلیم و تبلیغ میں صرف ہوئی " رانچی" کے درودیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں جہاں میں نے نظر بندی کا زمانہ بسر کیا (یہ تو میری زندی کا دائمی مقصد ہے میں صرف اسی کام کے لئے جی سکتا ہوں۔ ﴿إِنَّ صَلَاتِي ' وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

میں اس ''جرم'' سے کیوں کر انکار کر سکتا ہوں۔ جب کہ ہندوستان کی آخری "اسلامی تحریک" کا داعی ہوں جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹکل مسلک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔اور بالآخر وہاں تک پہچادیا جہاں آج نظر آرہے ہیں' یعنی ان میں سے ہر فرد میرے اس جرم میں شریک ہوگیا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں ایک اردو جرنل '' الہلال'' جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا' اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا۔ جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ''الہلال'' نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لئے بیورو کریسی کے ہاتھ

میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ ہند کی تفرقہ انداز پالیسی نے انہیں فریب میں مبتلا رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر ''الہلال'' نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی، اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریکِ خلافت و سوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کا زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے پہلے ''الہلال'' کی ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب ''البلاغ'' کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کر دیا۔

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ ''الہلال'' تمام تر آزادی یا موت کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک پر بحث و نظر کی بنیاد ڈالی۔ اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارا کروں گا کہ

ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو

روح پیدا کر رہے ہیں ۔ "الہلال" اس کام سے ۱۹۱۴ء میں
فارغ ہوچکا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں
اور ہندوؤں دونوں کی نئی اور طاقتور سرگرمی اُسی وقت
شروع ہوئی جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ
مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے پوری طرح فروغ پا لیا۔

ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وائلنس و نان کوآپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خونریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے۔ لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہ کرنا چاہیئے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے۔ میں اسے

فطرۃ الٰہی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لئے مہاتما گاندھی کے دلائل سے متفق ہوں اور ان دلائل کی سچائی پر پورا اعتماد رکھتا ہوں میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلینس جدوجہد کے ذریعے فتح مند ہوگا اور اس کی فتح مندی اخلاق و ایمان طاقت کی فتحمندی کی ایک یادگار مثال ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو باامن جدوجہد کی تلقین کی اور اس کامیابی کی سب سے پہلی شرط قرار دیا۔ خود یہ تقریریں بھی اس موضوع پر تھیں۔ جیسا کہ پیش کردہ نقول سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

دعوت عمل:

آنکھیں دیکھنے کے لئے ہیں۔ کان سننے کے لئے ہیں اور دل پہلو میں رکھا گیا ہے کہ بے قرار ہو' لیکن وہ سب کچھ تمہارے لئے بے کار ہو گیا ہے۔ جس کو آنکھ دیکھتی ہے اور وہ سب آوازیں بے اثر ہو گئی ہیں جو کانوں سے سنائی دیتی ہیں اور وہ تمام فکریں اور عبرتیں ڈوب گئیں جن سے دل تڑپتے اور روحیں بے قرار ہوتی ہیں۔ پس جو کچھ کہا جائے لاحاصل ہے اور جو کچھ کیا جائے بے کار ہے۔ آہ! تم غافل ہو گئے ہو تم پر موت کا پنجہ چل گیا ہے۔ تم گمراہی کے قبضہ میں آ گئے۔ تمہارے احساس فنا ہو گئے اور تمہارے دل کی دانائی میٹ دی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسا تھا کہ اندھے بینا ہو جاتے لنگڑے چلنے لگتے۔ گونگوں کی چیخ سے دنیا ہل جاتی اور لوہوں کے ہاتھ شیروں کے پنجوں کی طرح طاقتور ہو جاتے' آہ! تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی' اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے' آہ! تم ایسے نہ تھے۔

آہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں' اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے یہ کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو' اور

شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند ہیں' تم کیوں
اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو ۔ اور کیوں تمہاری
عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور
اور سمجھتے ہو پر نہ راستبازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی
ہے اور نہ گمراہوں کے نقشِ قدم کو چھوڑتے ہو۔

پس میں آج سب کچھ چھوڑ کے تم سے ایک ہی آخری بات کہنا چاہتا ہوں اور یقین کرو کہ اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے۔ اگر وہ اس بات کے لئے نہیں کہا جاتا تو سب کچھ بے کار ہے اور اس میں تمہارے لئے کوئی برکت و امن نہیں' سو یاد رکھو اور ماننے کے لئے جھک جاؤ کہ تمہاری زندگی کا ہر عمل بے کار ہے۔ اور تمہاری فکروں کی ہر گمراہی و ذلالت ہے۔ تمہارے لئے صرف ایک ہی راہ نجات ہے اور بغیر اس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گزرو گے اس وقت تک خدا کا قہر تم پر سے ٹھنڈا نہ ہوگا۔ اور تم کبھی مراد اور خوشحالی نہ پاؤ گے۔ تمہارے سفر عمل کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو' توبہ کرو' اپنی تمام قوتوں اور تمام طاقتوں کے ساتھ خدا کے آگے جاؤ۔ اس کے آگے اس طرح گرو اور اس طرح روؤ اور اس قدر تڑپو کہ اسے تم پر پیار آ جائے اور تمہیں پہلے کی طرح پھر اپنی گود میں اٹھالے' اور سب کچھ تمہیں کو دیدے کہ جس طرح کہ سب کچھ تمہیں کو اس نے بخشدیا تھا۔

تم نے غفلت کو خوب آزمالیا' تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑواہٹ چکھ لی۔ تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر لئے تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس طرح ساری دنیا تم سے سرکش ہوگئی اور ایک اس کے روٹھنے سے کس طرح تمام دنیا تم سے روٹھ گئی۔ پس مان جاؤ اور اب بھی باز آ جاؤ۔ گناہوں کو آزما چکے۔ آؤ تقویٰ اور راستبازی کو بھی آزمالیں سرکشیوں کو چکھ چکے آؤ اطاعت کا بھی مزہ دیکھیں۔ غیروں سے رشتہ جوڑ کے تجربہ کر چکے آؤ اُسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں۔ جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں' ٹھوکروں اور ماندگیوں کے سوا

کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

اگر تم کو اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے کہ اسے نہ دو گے اور اپنی جانوں کو اس کی محبت سے بھی پیارا سمجھتے ہو تو اس کے لئے دکھ میں نہ ڈالو گے اور اگر تمہارے دلوں کی آہیں' تمہارے جگر کی ٹیس' اور تمہاری آنکھوں کے آنسو' اب اس کے لیے نہیں رہے ہیں۔ بلکہ دوسروں کا مال ہو گئے ہیں۔ تو یقین کرو کہ وہ بھی تمہارا احتاج نہیں ہے اور اس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو اپنے کلمہ حق کی خدمت کے لئے درختوں کو چلا دے گا۔ پہاڑوں کو متحرک کر دے گا۔ کنکروں اور خاک کے ذروں کے اندر سی صدائیں اٹھنے لگیں گی۔ پر وہ فاسق اور نافرمان انسانوں سے کبھی بھی کام نہ لے گا۔ اور اپنے پاک کام کی عزت کو ناپاکوں کی گندگی سے کبھی آلودہ نہ ہونے دے گا۔

لکھنؤ کانفرنس

لکھنؤ سے واپس آنے کے بعد میں نے ضرورت محسوس کی تھی کہ آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنی چاہیئے۔ تاکہ عوام کو بطور خود سمجھنے اور رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ اسی خیال سے ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع ہی کیا تھا۔ لیکن ابھی اس سلسلہ کی پہلی قسط زیرِ قلم تھی کہ دہلی سے ''ہمدرد'' آیا اور اس میں برادر عزیز مولانا شوکت علی کا بیان نظر سے گزرا۔

ہم نے ہمیشہ مولانا شوکت علی کی تعریف میں یہ بات کہی ہے کہ وہ ایک عملی آدمی ہیں' اس لئے جوش سے زیادہ دماغ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی محسوس کی ہے کہ بعض اوقات پر یہ وصف اپنے مناسب حدود سے متجاوز ہوجاتا ہے اور اس لئے خطرے سے خالی نہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو بیان انہوں نے ''ہمدرد'' میں شائع کیا ہے۔ وہی اسی آخری حالت کا ایک نمایاں مظہر ہے۔ ہر شخص جو کانفرنس میں شریک رہا ہے' کانفرنس کی کاروائیوں کی وہ تصویر دیکھ کر جسے اُن کی پر غیظ مصوری نے کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے سوا کچھ محسوس نہیں کرسکتا کہ وہ بہت ہی زیادہ جوش میں آ گئے ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ جوش اور غصہ کا باہمی فرق بہت ہی خفیف رہا ہے۔

ہر دم آزردگی غیر سبب راچہ علاج؟
ما گزشتیم زلطف تو ' غضب راچہ علاج؟

اگرچہ لکھنؤ میں یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ وہ نمائندگانِ پنجاب کے فیصلہ سے خوش نہیں ہیں' لیکن اس کا مطلب یہی سمجھا گیا تھا کہ انہیں کسی وجہ سے اختلاف رائے ہے اور اس طرح کے معاملات میں اختلاف رائے ہوا ہی کرتا ہے یہ بات معلوم نہ تھی کہ اندر ہی

اندر ان کا مزاج اس درجہ برہم ہوگیا ہے کہ اظہار رائے اور بحث ونظر کی تمام ذمہ داریاں فراموش کر جائیں گے' اور اچانک غیظ وغضب میں آ کر ایسی باتیں لکھ جائیں گے جو صریح حقیقت کے خلاف ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ بیان شائع کر کے انہوں نے اپنی دماغی حالت کا کوئی بہتر مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ یہ ایک ایسی دماغی حالت ہے۔ جس میں غور فکر کے لئے مُطلق جگہ نہیں ہے' اور جسے صحت بیان وروایت سے بھی قطعاً انکار ہے!

بہرحال یہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے سرِ دست ملتوی کردوں اور پہلے وہ تمام حالات صاف صاف بیان کردوں جو کانفرنس میں اور کانفرنس سے پہلے پیش آئے ہیں۔ ان حالات کے پڑھنے کے بعد ہر شخص بآسانی فیصلہ کرے گا کہ لکھنؤ کانفرنس میں جو کچھ پیش آیا ہے اس کی حقیقی نوعیت اور صورت کیا ہے۔

لیکن سب سے پہلی بات جو قابل غور ہے وہ مولانا شوکت علی کا وہ تاثر ہے جو کانفرنس کی روئیداد سے انہوں نے حاصل کیا ہے اور جس سے دوسروں کو بھی متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیان کا عنوان یہ قرار دیا ہے "آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ اور مسلمانوں کی قسمت کا حشر" پھر اصل بیان حسرت والم کی اس زہرہ گداز تمہید سے شروع ہوگا ہے۔

> آزادی و اتحاد کا وہ تخیل جو ہمارے دلوں کو تقویت دیتا تھا لکھنؤ میں تقریباً موہوم ہوگیا۔

پھر لکھتے ہیں۔

> "صدر مجلس نے جس طرح مسلمان مقرروں اور مسلم نمائندوں کی تجویزوں اور تحریکوں کے ساتھ برتاؤ کیا' وہ کسی سخت سے سخت ناپسندیدہ غیر مسلم صدر کے ہاتھوں بھی ہونا ناممکن تھا۔"

اس کے بعد وہ خصوصیت کے ساتھ پنجاب کا ذکر کرتے ہیں جو ان کی اس صفِ

ماتم کی اصل الفنا کی ہے۔

جس طرح جمعیۃ خلافت کے فیصلہ کو خود پنجاب کے
حضرات سے بدلوا کر قابل مضحکہ بنایا گیا۔ اس کی طویل
اور دردناک داستان ہے۔

پھر مضمون کے آخر میں اپنی "سخت جانی" کا ذکر کرتے ہیں اور ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ "میں اپنی ذات کی حفاظت خود کر سکتا ہوں" اور مضمون اس شعر پر ختم کرتے ہوئے۔ جو بقول ان کے لکھنؤ میں ان کے وردِ زبان تھا

بکس بکس طرح ستاتے ہیں یہ بُت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

ان تمام باتوں کے پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ بدبخت مسلمانوں پر کوئی بڑی ہی سخت مصیبت نازل ہوئی ہے اور اب مولانا شوکت علی اپنے دلِ صد چاک اور جگر پاش پاش سے خونابہ حسرت بہا رہے ہیں۔

لختے بردازوں گزرو ہر کہ زچشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

مسلمانوں کی قسمت پھوٹ گئی ان کی امیدوں آرزوؤں کا جنازہ نکل گیا۔ اتحاد وہم وخیال ہوگیا۔ صدرِ مجلس نے مسلمانوں کے خلاف سازش کرلی۔ پنجاب کے نمائندوں کا اتفاق ایک "طویل" اور دردانگیز حادثہ ہے۔ کانفرنس ایک میدان دار و گیر اور معرکہ زد و خورد تھا۔ جس سے بچ کر نکل آنے پر اپنی "سخت جانی" کی منت پذیریاں ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مایوسیوں اور درماندگیوں کا یہ عالم ہے۔

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

لیکن اس کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر یہ تمام نالۂ وشیون

اور آہ و بکا کس غرض سے ہے؟ کانفرنس کی وہ کونسی کارروائی ہے۔ جس سے اسلام اور مسلمانوں کی یہ زہرہ گداز ٹریجڈی ظہور میں آئی ہے؟

کیا یہ مرثیہ خوانی اس لئے ہے۔ کہ مسلمانوں کے جس قدر اصولی مطالبات کانفرنس کے سامنے تھے۔ وہ نامنظور کردیئے گئے؟

کیا اس لئے کہ سندھ کی علیحدگی سے انکار کردیا گیا؟

کیا اس لئے کہ صوبہ سرحد کا مطالبہ منظور نہیں ہوا؟

کیا اس لئے کہ مولانا شوکت علی صاحب جُداگانہ نیابت کے خواہشمند تھے۔ اور کانفرنس نے انکار کردیا؟

کیا اس لئے کہ شوکت علی صاحب پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور کانفرنس نے فیصلہ کردیا۔ کہ اکثریت نہیں ہونی چاہیئے۔

اور پھر کیا اس لئے کہ لکھنؤ کانفرنس تقسیم حقوق کا آخری دروازہ تھا جو ایک مرتبہ کُھل کر ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اور اگر کوئی جماعت کسی معاملہ پر مزید غور و فکر کرنا چاہتی ہے۔ تو اس کے لئے اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے کہ اپنے بال نوچے اور در و دیوار سے ٹکرائے؟

مولانا شوکت علی ہمیں نہیں بتلاتے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ہوئی ہے۔ پھر آخر کونسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ کہ تمام مسلمانوں کو واحسرتا! وامصیبتا! کے نالہ و فریاد کی دعوت دی جارہی ہے؟

صرف یہ کہ مولانا شوکت علی چاہتے تھے۔ کہ مسلمانانِ پنجاب ہمیشہ کے لئے نشستوں کے تحفظ سے دست بردار ہوجائیں مگر صرف دو انتخاب تک کے لئے نشستیں معیّن کردی جائیں۔ لیکن نمائندگان پنجاب کے اتفاق سے جو تجویز منظور ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے دست بردار نہیں ہوسکتے صرف دو انتخاب کے لئے بطور تجربہ منظور کرتے ہیں!

میں یہاں ان دونوں تجویزوں کا مقابلہ نہیں کروں گا۔ یہ بحث آگے آتی ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے۔ کہ جس بات پر مولانا شوکت علی نے اپنی تمام مرثیہ خوانیوں اور خونابہ فشانیوں کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ صرف یہی معاملہ ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ وہی تجویز بہتر تھی۔ جسے شوکت علی صاحب بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا صرف اتنا سا اختلاف کہ ایک تجویز سے اصولاً اتفاق کرتے ہوئے اسے دس سال کے بعد اختیار کرایا جائے۔ کوئی ایسا معاملہ ہے۔ کہ اس کی بنا پر "مسلمانوں کی قسمت کا حشر" اور "اُن کی اُمیدوں کا خاتمہ" اور "اتحاد کا موہوم ہو جانا" اور "مولانا شوکت علی کی سخت جانی" اور

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

اور اسی طرح کی تمام ہلاکتیں اور مصیبتیں پیش آ گئی' اور اب شوکت علی صاحب اس قتل گاہِ اسلام و مسلمین سے نکل کر مسلمانوں کو پکار رہے ہیں۔ کہ صفِ ماتم بچھائیں اور سینہ پیٹنا شروع کر دیں؟ فی الحقیقت وقت کا سوال یہ نہیں ہے۔ کہ لکھنؤ کانفرنس میں مسلمانوں کی قسمت کا کیا حشر ہوا؟ سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اگر ۱۹۲۸ء میں بھی ہماری پبلک لائف کا یہ حال ہے۔ کہ ملک کے سیاسی مستقبل جیسے اہم اور نازک معاملہ میں ذمہ دار لیڈروں کا قلم بالکل بے قابو ہو جاتا ہے۔ اور وہ محض ایک جزوی اختلاف کی سعی اور تدبیر کا تمام کارخانہ درہم برہم کر دینے کے لئے آستینیں چڑھا لیتے ہیں تو پھر میں نہیں سمجھتا ہمارے لئے عقل و تمیز میں سے کیا باقی رہ گیا ہے۔ اور مسلمانوں کی جماعتی زندگی اور جماعتی جدوجہد پر کیوں نہ فاتحہ خیر پڑھ دیا جائے۔

یہ ملک کے لئے سیاسی موت و حیات کی فیصلہ کن گھڑی ہے۔ یہ اُن مسائل و مباحث کا میدان ہے۔ جن سے تیس کروڑ انسانوں کی قسمت تعمیر ہوگی۔ مسائل قدرتی طور پر پیچ در پیچ ہیں۔ اور جماعتوں کی باہمی کش مکش اور آب و ہوا کی ناموافقت نے طرح طرح کی مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔ ناگزیر ہے کام کرنیوالوں میں اختلاف رائے ہو۔ اور ممکن نہیں کہ ہر نگاہ ایک ہی زاویہ سے ہر چیز کو دیکھے بلاشبہ ہر دیانت دار انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنی رائے میں جو بات صحیح سمجھتا ہے اس پر پوری طرح زور دے۔ اور دلائل سے اس کی

قوت ظاہر کرے۔ لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ جہاں کسی ذرا سی بات میں اختلاف ہوا اور ہماری بات نہ چلی' فوراً قلم اٹھایا اور قوم کی تباہی و بربادی اور مخالف رائے رکھنے والوں کی ایمان فروشی کا اعلان کر دیا۔ اگر مولانا شوکت علی نمائندگان پنجاب کے فیصلہ کے بعد بھی محسوس کرتے تھے۔ کہ منظور کردہ تجویز ٹھیک نہیں ہے تو یقیناً انہیں حق تھا۔ کہ اس کے خلاف اپنی رائے ظاہر کرتے اور اپنے دلائل پر زور دیتے کیونکہ بہر حال کانفرنس کی بحثیں اس معاملہ کا خاتمہ نہیں ہیں۔ اور رپورٹ دوبارہ غور کرنے کے لئے کمیٹی کو دیدی گئی ہے لیکن یہ اظہار اختلاف اسی طرح ہونا تھا۔ جس طرح ہمیشہ ایک ذمہ دار آدمی کیا کرتا ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ کہ جب تک مسلمانوں کی قسمت نہ پھوڑ دی جائے۔ مخالف رائے رکھنے والوں پر بے جا اور بے اصل الزامات نہ لگائے جائیں۔ اور مسلمانوں کے قتل عام کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ اس وقت تک ہمارا اختلاف رائے بحث و بیان میں آ ہی نہیں سکتا؟ یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ کہ مولانا شوکت علی کے لئے دو صورتوں کے سوا تیسری صورت کبھی نہیں ہو سکتی یا تو مسلمانوں کا ستارہ اچانک اوج ثریا تک پہنچ جائے' یا یکا یک تحت الثریٰ میں ڈوب جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ بیچ کا کوئی مقام پیش آئے۔ اگر ان کی بات مان لی گئی۔ تو مسلمانوں کی قسمت اچھل کر آسمان سے جا ٹکرائی نہ مانی گئی تو فوراً ڈوب گئی۔ ابوفراس نے کہا تھا

ونحن أناس لا توسط بيننه

لنا الصّدر دون العلمين او القبر!

یعنی ہم وہ لوگ ہیں۔ کہ ہماری ہمتوں کیلئے بیچ کی جگہ کبھی نہیں ہوتی۔ یا تو ساری دنیا سے اُوپر رہتے ہیں۔ یا پھر زمین کے نیچے قبر میں۔ اگرچہ اس شعر کا سب سے زیادہ عجیب استعمال ہوگا۔ مگر میں یہ خیال کرتا ہوں' اپنے طور پر مولانا شوکت علی بھی یہ شعر پڑھ سکتے ہیں۔

میں اس موقعہ پر اس بات کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جذبات و تاثرات کی یہی وہ بے لگام افراط و تفریط ہے۔ جس نے آج برسوں سے ہماری پبلک لائف

تہ و بالا کر رکھی ہے۔ جو لوگ جماعتی کاموں میں حصہ لے رہے ہیں ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے۔ جنہوں نے ہوش میں آنا اور جوش دلانا تو سیکھ لیا ہے لیکن محل اور مقدار کا سوال ان کے لئے بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر ان کی دماغی ساخت کو گھڑی سے تشبیہ دی جائے۔ تو اس گھڑی میں ٹِک ٹِک کرنے کے تمام پرزے موجود ہیں۔ مگر ریگولیٹر کی جگہ خالی رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ قوم کی قوم محض چند انسانوں کی بے لگام اثر پزیریوں کے رحم پر ہے۔ جہاں کسی نے مہل اور لغویات پر جشن و کامرانی کا غلغلہ بلند کر دیا۔ لوگ جوشِ مسرت میں بیخود ہو کر ناچنے لگے۔ جہاں کسی نے فضول سی بات پر بربادی و ہلاکت کا ماتم شروع کر دیا۔ لوگ لگے دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹنے' خوشی کی بات ہو یا غم کی' اس بازار میں مَن سے لے کر چھٹانک تک ہر بٹہ کا ایک ہی وزن ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ مولانا شوکت علی کا یہ بیان پڑھ کر بہت سے ماتم گزار ان قوم نے بغیر اس کے کہ رونے کا سبب معلوم کیا ہو' بے تکان رونا شروع کر دیا ہوگا۔ اگر مولانا شوکت علی اس قدر جلد منہ بسور سکتے ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ قوم کو دھاڑیں مار کر رونے میں کیا دیر لگتی ہے؟ لوگ یہ نہیں سوچا کرتے کہ کیوں روئیں؟ وہ کہتے ہیں۔ اگر ایک اچھا خاصہ آدمی رو رہا ہے۔ تو ہم بھی کیوں نہ روئیں؟

اذ کان ربّ البیت بالطبل ضا رباً

فلاتلم الا ولاد نیہ علی الرقص!

نہیں کہا جا سکتا یہ حالت کب تک باقی رہے گی۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر یہ صورت حال ہم اسی طرح گوارہ کرتے تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا خدا حافظ ہے۔ وقت کا سوال یہ نہیں ہے۔ کہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کی ضرورت ہے یا مخلوط انتخاب کی؟ اصلی سوال یہ ہے۔ کہ انہیں اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر میں عقل و دماغ کی ضرورت ہے۔ یا محض اشتعال وانفعال کی؟

ہمہ اندرز من بتو اینست

کہ تو طفلی و خانہ رنگین ست
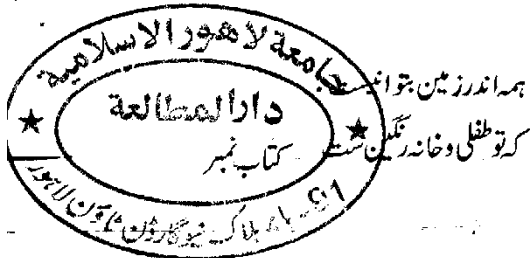
بہرحال مولانا شوکت علی کا یہ تمام وشیون حکایت شتر وگربہ سے زیادہ نہیں اور اسی سے اندازہ کرلیا جاسکتا ہے۔ کہ ان کی موافقت ومخالفت اور ردو قبول کا معیار کیا ہے؟ اب میں چاہتا ہوں، تفصیل کیساتھ وہ تمام واقعات بیان کردوں جو کانفرنس سے پہلے اور کانفرنس میں ان مسائل کے متعلق پیش آئے ہیں۔

یہ معلوم ہے۔ کہ آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے مسلمانوں کی جانب سے وہی مطالبات تھے۔ جو مشہور "تجاویز دہلی" میں پیش کئے گئے تھے۔ اور جنہیں مدارس کانگرس نے بھی بجز ایک مطالبہ کے منظور کرلیا تھا۔ ان مطالبات میں یہ بات بھی تھی کہ انتخابات مخلوط ہوں۔ مگر نشستیں آبادی کے تناسب سے محفوظ کردی جائیں۔ دہلی میں ہندو مہاسبھا اور سکھ لیگ کی مخالفت کی وجہ سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ کانفرنس کی ساری بحث سندھ کے معاملہ میں سمٹ آئی تھی اور سندھ کے ہندو اور ہندو مہاسبھا کے نمائندے کسی طرح بھی اس کی علیحدگی منظور نہیں کرتے تھے۔ بمبئی میں جب دوبارہ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس وقت بھی حالت بدستور تھی۔

بالآخر نہرو کمیٹی منتخب ہوئی اور اس نے کام شروع کیا۔ میں بمبئی نہیں جاسکا تھا۔ اس لئے ذاتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کیا حالات پیش آئے۔ سب سے پہلے نہرو کمیٹی کے مباحث میرے علم میں اس وقت آئے ہیں۔ جب ۲۰ جون کو مسٹر سبھاش چندر بوس الہ آباد سے واپس آئے اور انہوں نے مجھے بتلایا کہ اکثریت کے لئے نشستوں کے تحفظ وعدم تحفظ کے مسئلہ پر ردوکد ہورہی ہے۔ اس موقعہ پر پنڈت موتی لال نہرو نے مجھے بھی بلایا تھا۔ کہ ایک دن کے لئے الہ آباد جاکر کمیٹی کے مباحث میں حصہ لوں مگر میں نہیں جاسکتا تھا۔ مسٹر بوس نے الہ آباد سے آکر بنگال کانگرس کمیٹی کے ہندو ممبروں کے ایک دو بے ضابطہ جلسے بحث ومشورت کیلئے منعقد کئے اور صوبے کی آبادی کی نوعیت اور عام انتخابات کے نتائج پر غوروفکر کیا۔ ان مشوروں کا نتیجہ یہ تھا کہ:۔

بنگال کے ہندو ارکان کانگرس محسوس کرنے لگے۔ کہ اگر مسلمانوں کے لئے

نشستوں کی تعداد معین نہ کر دی گئی تو بہت زیادہ امکانات موجود ہیں۔ کہ اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ نشستیں حاصل کرلیں گے۔ کیوں کہ پریذیڈنسی ڈویژن اور بردوان ڈویژن کے سوا کہیں بھی ہندوؤں کی اکثریت نہیں ہے۔ اور صوبہ بھر میں انکی اقلیت کا جس قدر بھی تناسب ہے۔ وہ ان دو ڈویژنوں کی اکثریت کی وجہ سے بہت زیادہ اقلیت میں مبدل ہوگیا ہے۔ ان کا متفقہ فیصلہ یہ تھا۔ کہ بنگال میں مسلمانوں کے لئے نشستوں کا تحفظ ہندوؤں کے لئے مفید ہے۔ اور اس لئے کہ اگر مُسلمانوں مُصر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے انکار کیا جائے۔

چنانچہ بار بار مجھ سے خواہش کی گئی کہ میں الہ آباد جاؤں اور پنڈت جی کو اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ کسی نہ کسی طرح پنجاب کے لئے سکھوں کو راضی کر لیں اور دو نشستوں کے تحفظ کے معاملہ میں مزید کاوش نہ کی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو کم از کم بنگال کے لئے نشستوں کا تعین تسلیم کرلیا جائے۔

۷ جولائی کو الہ آباد کانفرنس میں شریک ہوا۔ اس کانفرنس میں علاوہ ممبران کمیٹی کے ڈاکٹر مختار احمد نصاری' ڈاکٹر سیف الدین کچلو' ڈاکٹر سیّد محمود' مولوی محمد شفیع داؤدی' مسٹر تصدق احمد شروانی' پنڈت مالویہ مسٹر بحد انند سنہا اور چوہدری خلیق الزماں بھی شریک تھے۔

اس موقعہ پر یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ بحث و بیان میں آیا۔ بیان کیا گیا کہ ''تجاویز دہلی'' میں جو مطالبات پیش کئے گئے تھے۔ کانگرس نے بجز ایک مطالبہ کے ان سے اتفاق کرلیا تھا۔ یہ اتفاق دلائل و وجوہ کی بنا پر نہیں تھا۔ سمجھوتے کی اسپرٹ میں ہوا تھا۔ اگر آل پارٹیز کانفرنس میں بھی اتفاق ہوجاتا تو سرِ دست یہ معاملہ ختم تھا۔ مگر اتفاق نہیں ہوا۔ اور یہ سب کمیٹی مقرر کی گئی۔ اب ہم نے تمام مسائل پر تفصیل و بحث کے ساتھ نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ جہاں تک کانگرس کی تجویز کا تعلق ہے۔ تمام مطالبات اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن پنجاب اور بنگال کے لئے نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ نہ تو اصولاً صحیح ہے۔ نہ ضرورت کی بنا پر قابل قبول ہے۔ اصولاً اس لئے نہیں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ضرورت کی بنا پر

اس لئے نہیں کہ گو پورے صوبے میں مسلم اکثریت کی میزان بہت زیادہ نہیں ہے لیکن آبادی کی تقسیم کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے۔ کہ انتخاب میں ان کی اکثریت کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ بہت ممکن ہے۔ آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ نشستیں حاصل کر لیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو کیوں مسلمان ایک غیر ضروری بات پر اصرار کر کے اپنا مقدمہ کمزور کر رہے ہیں۔ اور سکھ بھائیوں کو نئی نئی فرمائشوں پر اڑنے کا موقع دیتے ہیں؟ اس بیان کی تائید میں شمار و اعداد کے وہ نقشے پیش کئے گئے۔ جو مسٹر جواہر لال نہرو نے کمیٹی کے لئے تیار کئے تھے۔ اور جواب رپورٹ کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔

اس کے جواب میں وہی بات کہی گئی جو ہمیشہ کہی گئی تھی۔ یعنی نیابتی حکومت ہونے کی صورت میں سوال صرف آبادی کی کثرت و قلت کا نہیں ہوتا بلکہ انتخابی قوت کے ضعف و قوت کا ہوتا ہے۔ بنگال اور پنجاب میں اگرچہ مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ مگر ان کی ووٹنگ کی قوت اتنی کمزور ہے۔ کہ ۵۵ فی صدی ہونے پر بھی ۴۰ فی صدی سے زیادہ نہیں ہیں۔ پس فی الحقیقت ان صوبوں میں بھی انکی اقلیت ہے اکثریت نہیں ہے اور اسی لئے میدان چاہتے ہیں۔ کہ آبادی کے تناسب سے ان نشستوں کی تعداد محفوظ کر دی جائے۔

لیکن اس کے جواب میں بتلایا گیا۔ کہ کمیٹی نے فرنچائز کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یہ بات بطور مقدمہ کے تسلیم کر لی ہے۔ کہ ہندوستان کو بغیر کسی تامل کے ایڈلٹ سفریج (عام حق رائے دہندگی) کا اصول تسلیم کر لینا چاہئے۔ اور اس صورت میں یہ روک خود بخود دور ہو جاتی ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس گفتگو کے بعد میں نے محسوس کیا کہ معاملہ ہر طرح قابل غور ہے۔ اور فرنچائز کے حل نے ہمارے سامنے وہ راہ کھول دی ہے۔ جو فی الحقیقت ملک کی انتخابی مشکلات کا ایک ہی صحیح حل تھا۔ مگر اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تھی۔ یہ واقعہ ہے۔ کہ جب کبھی مسلمانوں کی طرف سے بنگال اور پنجاب میں نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا۔ تو اسی بنا پر کیا گیا کہ ان دونوں صوبوں میں انکی اکثریت چار یا پانچ سے زیادہ نہیں

اور چونکہ اقتصادی حالت کمزور ہے۔ اور حق رائے دہندگی کا معیار جائداد ہے۔ اس لئے ووٹنگ کی قوت اس سے بہت کم ہے۔ جس قدر آبادی کے اعتبار سے ہونی چاہئے۔ ایسی حالت میں اگر نشستیں محفوظ کردی گئیں۔ تو اس کا خطرہ رہے گا کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت مفقود ہوجائے۔ بلاشبہ کئی بار یہ پہلو بھی نمایاں ہوا تھا۔ کہ کیوں نہ حق دہندگی اس درجہ وسیع کردیا جائے۔ کہ یہ حالت دور ہوجائے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں جب آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ تو مہاتما گاندھی نے ایک تجویز پیش بھی کی تھی۔ لیکن ہمیشہ یہی کہا گیا۔ کہ اس حالت کا علاج صرف ایڈلٹ سفریج ہے۔ اور وہ بحالت موجودہ ممکن نہیں۔ اب اگر ایڈلٹ سفریج اختیار کیا جارہا ہے اور مسلمانانِ پنجاب و بنگال کی انتخابی قوت ان کی آبادی کی مناسبت سے قائم ہوجاتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اصلی علّت باقی نہیں رہی اور اس لئے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ کہ ایک طرف تو مسلمان انتخابی طرز حکومت کے مطالبہ میں بھی شریک ہوں۔ اور دوسری طرف اس کا بھی مطالبہ کریں۔ کہ باوجود مساویانہ انتخابی قوت کے انہیں مزید تحفظ کی ضرورت ہے۔

بایں ہمہ چونکہ مسئلہ اہم اور نازک تھا۔ مشکل تھا۔ کہ فوری رائے قائم کرلی جائے ۷ جولائی کانفرنس میں گھنٹوں بحث ہوتی رہی۔ بڑی مشکل اسطرز عمل کیوجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ جو سکھ لیگ کی طرف سے سردار منگل سنگھ صاحب نے اختیار کیا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ اگر پنجاب میں نشستوں کا تعین نہیں کیا جاتا۔ تو سکھ باوجود ۱۱ فیصدی ہونے کے کسی طرح کا مطالبہ نہیں کرتے۔ لیکن اگر نشستوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ تو پھر انہیں آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں ملنی چاہئیں کیونکہ انیس فیصدی اس وقت بھی انہیں حاصل ہیں۔ او پنجاب کے علاوہ اور کسی صوبے میں ان کی وقیع آبادی موجود نہیں۔

بہرحال کانفرنس نے جو تجویز منظور کی وہ رپورٹ میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ نشستوں کا تحفظ کسی کیلئے نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر طریقہ کے علاوہ سمجھوتے کی کوئی دوسری صورت نہ نکلے تو پھر صرف دس سال کیلئے نشستوں کا تحفظ ہو۔ اس کے بعد خود بخود دور

ہو جائے۔ بہت کوشش کی گئی کہ سردار منگل سنگھ اس تجویز سے متفق ہو جائیں۔ مگر نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ سکھوں کو ایک تہائی سے زیادہ نشستیں ملنی چاہئیں۔

اسی دن رات کو خواجہ عبدالمجید صاحب کے یہاں کھانا تھا۔ ڈاکٹر انصاری ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر محمود، مولوی محمد شفیع داؤدی، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر شروانی وغیرہ ہم موجود تھے۔ کھانے کے بعد اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہی اس موقعہ پر میں نے تفصیل کے ساتھ بنگال کے حالات بیان کئے۔ اور واضح کیا کہ آبادی کی نوعیت اور اس کے شمار و اعداد پہلے بھی بار بار ہمارے سامنے آ چکے ہیں اور ہمیشہ یہ بات محسوس کی گئی ہے۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت کے لئے عام انتخابات میں کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن جس معاملہ نے ہمیشہ رکاوٹ پیدا کی وہ فرنچائز کا معاملہ ہے۔ اگر ایڈلٹ سفریج کو بطور ایک لازمی شرط کے تسلیم کر لیا جائے تو پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ کہ کیوں بنگال کے لئے تحفظ ضروری ہو۔ میں نے خیالات کی اس تبدیلی کا بھی ذکر کیا۔ جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے پچھلے انتخابات کے نتائج نے پیدا کر دی ہے اور جداگانہ انتخاب کے حامی بھی تسلیم کرنے لگے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی کامیابی کے لئے جداگانہ انتخاب کی نہیں بلکہ صرف انتخابی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

گفتگو کے خاتمہ پر سب کی رائے یہی قرار پائی۔ کہ اس معاملہ پر از سر نو نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور بنگال پنجاب کے لوگوں سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کہ اس نئی صورتِ حال کی روشنی میں کیوں تحفظ پر زور دیا جائے۔

خود مسلمانوں کے جماعتی فوائد کے لحاظ سے عدم تحفظ کے جو نتائج نکل سکتے تھے۔ وہ میرے خیال میں سب سے زیادہ اہم تھے۔ میں نے ان کی طرف بھی اشارہ کیا۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں اس لئے آگے چل کر اپنے محل میں بیان کئے جائیں گے۔

کلکتہ سے واپس آ کر میں نے سب سے پہلے ان حضرات سے گفتگو کی جو کانگرس اور لیگ کے حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضرات اس وقت تک نشستوں کے تحفظ پر مصر تھے۔ اور میں چاہتا تھا۔ اگر اس کی تائید میں دلائل موجود ہیں۔ تو اچھی طرح نمایاں

ہو جائیں تاکہ آل پارٹیز کانفرنس سے پہلے ایک محتاط رائے قائم کی جا سکے' لیکن جب گفتگو تفصیلات میں گئی اور وجوہ دلائل بحث میں آئے تو سب نے محسوس کیا۔ کہ کوئی دلیل اس کی تائید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعد میں نے چاہا۔ کہ ان حضرات سے مشورہ کیا جائے۔ جو نہ صرف نشستوں کے تحفظ پر ہی زور دینے والے ہیں بلکہ سرے سے مخلوط انتخاب ہی کے مخالف ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے سر عبدالرحیم سے گفتگو کی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ مسلم لیگ کلکتہ کی تجویز سے بھی متفق نہ تھے۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی انہوں نے جداگانہ انتخاب وغیرہ امور پر زور دیا۔ لیکن میں نے ان سے درخواست کی۔ کہ آخری رائے قائم کرنے سے پہلے بہتر ہے۔ ایک مرتبہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر از سر نو بحث کر لی جائے۔ اگر آخری فیصلہ یہی ہوا کہ نشستوں کا تحفظ ضروری ہے۔ تو آل پارٹیز کانفرنس میں بھی اسی پر زور دیا جائے گا انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔

میں نے مولوی مجیب الرحمٰن صاحب سیکرٹری بنگال پروونشل مسلم لیگ سے کہا۔ کہ وہ مشورہ کے لئے ایک جلسہ طلب کریں۔ چونکہ بنگال کونسل کے جلسے ہو رہے تھے۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ خصوصیت کے ساتھ ان ممبران کونسل کو طلب کیا جائے جو جداگانہ انتخاب کے مشہور حامی ہیں۔ چنانچہ ۴ اگست کو یہ جلسہ خود سر عبدالرحیم کے مکان میں منعقد ہوا۔ جلسہ میں علاوہ صاحب مکان کے مولوی عبدالکریم صاحب' مولوی فضل الحق صاحب' خان بہادر مقبول حسین صاحب' خان بہادر تمیز الدین صاحب وغیرہ ہم میں موجود تھے۔ جن سے زیادہ جداگانہ نیابت کا حامی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مولوی فضل الحق تو چار دن پہلے کونسل میں اپنی ترمیم پیش کر چکے تھے۔ اور خان بہادر مقبول حسین نے ان کی تائید کی تھی۔ ان حضرات کے علاوہ مولوی مجیب الرحمٰن صاحب سیکرٹری مسلم لیگ' مولوی منیر الزمان صاحب سیکرٹری جمعیت العلماء مولوی محمد اکرم خاں ایڈیٹر محمدی' مولوی عبدالباقی صاحب صدر جمعیت العلماء دیناجپور' وغیرہ ہم میں بھی موجود تھے۔ میں نے ان تمام حضرات کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا۔ اور تفصیل کے ساتھ وہ تمام پہلو بیان کر دیئے جو میرے خیال میں قابلِ غور تھے۔ تین

گھنٹہ تک بحث جاری رہی۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلا اور بالاتفاق سب نے فیصلہ کیا کہ "اگر ایڈلٹ سفرتج نفاذ میں آ جائے تو بنگال کے لئے نشستوں کا تحفظ غیر ضروری ہے۔ خاتمہ بحث پر میں نے یکے بعد دیگرے تین بار دریافت کیا' کہ آل پارٹیز کانفرنس میں مجھے بنگال کے لئے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے؟ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا۔ اس بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ لیکن ہر مرتبہ مجھے یہی جواب دیا گیا۔ کہ "ایڈلٹ سفرتج منظور ہو جائے تو نشستوں کے تحفظ پر زور دینا ضروری نہیں"۔

پنجاب کا مسئلہ:

میری دلی خواہش تھی کہ پنجاب کے حضرات بھی اسی طرح دلیل اور حقیقت کی بنا پر مطمئن ہو کر ایک رائے قائم کر لیں۔ ۱۱ جولائی کو جب میں دہلی میں تھا۔ تو ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے کوشش کی تھی۔ کہ پنجاب مسلم لیگ کے ارکان سے اس بارے میں مشورہ کر لیں لیکن اس وقت بجز ڈاکٹر محمد عالم صاحب کے اور کسی صاحب سے گفتگو نہ ہو سکی۔ ۱۵ اگست کو جب نہرو کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی۔ تو ڈاکٹر محمد عالم صاحب' ملک برکت علی صاحب اور سر محمد اقبال صاحب کی رائیں اخبارات میں میری نظر سے گزریں۔ اول الذکر حضرات نے تائید کی تھی اور سر محمد اقبال نے گو تائید نہیں کی تھی۔ لیکن پیرائیہ بیان نہایت مُعتدل تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کم از کم اسے قابل غور بحث سمجھتے ہیں۔

۲۵ اگست کو میں لکھنؤ پہنچا تو پنجاب کے دوستوں سے ملاقات ہوئی میں نے محسوس کیا کہ ایڈلٹ سفرتج ہونے کی صورت اور پنجاب کی آبادی کی تقسیم کی وضاحت نے نشستوں کے تحفظ کا اعتقاد متزلزل کر دیا ہے۔ اور کوئی وزنی دلیل اس کے خلاف نمایاں نہیں ہوتی۔ تاہم چونکہ معاملہ اہم ہے اور ذمہ داری گراں' اس لئے قدرتی طور پر طبیعتوں میں ایک طرح کا اضطراب و تامل باقی ہے ایک بڑا سبب اس تامل کا یہ بھی تھا۔ کہ مولوی عبدالقادر صاحب قصوری اور مولوی ظفر علی خاں صاحب ابھی ابھی سفرِ حجاز سے لوٹے تھے۔ اور غازی عبدالرحمٰن صاحب اور مولوی حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی جیل سے نکلے

تھے۔ان حضرات کو ۲۵ اگست تک پورا موقعہ رپورٹ کے پڑھنے اور رائے قائم کرنے میں دیا جاتا اور جلدی نہ کی جاتی۔ ابھی پانچ دن کی مہلت ہمارے لئے موجود تھی۔اور بہ اطمینان رائے قائم کی جاسکتی تھی۔لیکن نہیں معلوم کیوں ۲۶ اگست کو کوشش کی گئی۔کہ مرکزی خلافت کمیٹی میں کوئی نہ کوئی تجویز پاس ہوجائے میں جلسہ میں ایک گھنٹہ کی تاخیر سے پہنچا تھا۔جب میں نے عنوان بحث دریافت کیا۔تو مولانا شوکت علی نے بتلایا کہ :۔

تمہارے آنے سے پہلے ہم نے یہ بات طے کرلی ہے۔کہ یہ معاملہ پنجاب کا ہے۔اور اس لئے پنجاب کے مسلمان نمائندوں پر چھوڑ دینا چاہیئے جو کچھ ان لوگوں کا فیصلہ ہوگا۔وہی خلافت کمیٹی کی رائے ہوگی۔

چنانچہ ایک دو تقریروں کے بعد اس بات پر زور دیا کہ ہمیں نہرو کمیٹی کی تجویز سے اتفاق ہے۔ہم تیار ہیں کہ اسے قبول کرلیں۔لیکن ہم چاہتے ہیں۔اس کا نفاذ دو انتخاب یا ایک انتخاب کے بعد ہوتا کہ ہم اپنے آپ کو تیار کرلیں اسکے بعد تجویز پیش کی گئی۔کہ پنجاب کے لئے دس برس تک یعنی دو انتخابوں تک نشستیں محفوظ رکھی جائیں۔اس کے بعد خود بخود (آٹومیٹکلی) نشستوں کا تحفظ باقی نہیں رہے گا۔

چونکہ یہ بات طے پاچکی ہے۔کہ اس بارے میں نمائندگان پنجاب ہی کا فیصہ فیصلہ ہوگا۔اس لئے صدر مجلس نے صرف ارکانِ پنجاب کی رائیں شمار کیں سات رائیں تجویز کی موافقت میں تھیں۔چار مخالف تحقیق رائے لینے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ اب پورے جلسہ کی بھی رائے لی جائے یا نہ لی جائے؟ عام طور پر اعتراض کیا گیا۔کہ جب فیصلہ پنجاب کے حضرات پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے تو پھر دوسروں کی رائے لینا بیکار ہے۔لیکن میں نے اور بعض دیگر ارکان نے اصرار کیا کہ بقیہ ممبروں کو بھی اظہار رائے کا موقعہ دینا چاہیئے۔ چنانچہ رائے شماری کی گئی۔ غالباً ستائیس اٹھائیس رائیں موافق تھیں۔ پندرہ سولہ رائیں مخالف تھیں۔

خطرناک تجویز:

میں نے اس تجویز کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ کیونکہ میرے خیال میں بوجوہ یہ تجویز صحیح نہ تھی۔

۱۔ نہرو کمیٹی نے جو تجویز پیش کی تھی ۔وہ یہ تھی کہ ایڈلٹ سفریج ہونکی صورت میں پنجاب کے مسلمانوں کیلئے تحفظ ضروری نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اس تجویز پر غور کریں۔ اگر صحیح ہے تو منظور کریں۔ غلط ہے تو انکار کر دیں۔ اس کے کیا معنی کہ گیارہویں برس سے منظور کر لینے کا اعلان کرتے ہیں۔اور دس برس تک کے لئے تحفظ کے طالب ہیں؟

۲۔ جلسہ میں بیان کیا گیا تھا۔ کہ نہرو رپورٹ میں تحفظ کے خلاف جو دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ وہ صحیح ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی کمزوری دیکھتے ہوئے خوف کیا جاسکتا ہے۔ کہ ممکن ہے کامیابی نہ ہو۔ اگر فی الحقیقت ہماری پوزیشن یہی تھی۔اور ہم سمجھتے تھے کہ تحفظ نہ ہونا خطرہ سے خالی نہیں تو پھر اس سے بڑھ کر خطرناک بات کیا ہوسکتی ہے۔ کہ بغیر تجربہ کئے ہوئے ہمیشہ کیلئے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالیں۔اور کہہ دیں کہ صرف دس برس تک ہمیں خطرہ میں نہ ڈالیے۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے کود پڑیں گے۔ ہر انسان جو اس طرح کے معاملات کی موٹی سی سمجھ بھی رکھتا ہے۔ یہی کہے گا کہ اس صورت میں صحیح طریقہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ یعنی ہمیشہ کے لئے جو کچھ کرنا ہے اس کا فیصلہ نہ کریں۔ پہلے بطور تجربہ کے کچھ دن آزما کر دیکھ لیں۔ اگر بات ٹھیک نکلی تو ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیں گے۔ غلط نکلی تو خطرہ سے بچنے کا دروازہ کھلا رہے گا۔

۳۔ پنجاب میں تین مقابل جماعتوں نے یعنی مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں نے ایک خاص طرح کا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ اگر یہ الجھاؤ ایک طرح کی بیماری ہے۔ تو نہرو کمیٹی کی تجویز کو نیا نسخہ سمجھنا چاہیئے۔ دنیا جہاں کی عقل یہی کہے گی کہ پہلے نسخہ آزمانا چاہیئے۔ اور بصورت عدم شفا ترک کر دینے کا حق محفوظ رکھنا چاہیئے۔ یہ کہاں کی عقل ہے۔

کہ دس برس تک ہمیں اور بیمار چھوڑ دیجئے گیارھویں برس سے ہر نسخہ پینا شروع کر دیں گے۔خواہ شفا حاصل ہو، خواہ موت!

۴۔ فرض کرو دس برس تک کیلئے نشستیں محفوظ کر دی گئیں اور اس کے بعد اڑا دی گئیں۔اڑا نہیں دی گئیں جیسا کہ خلافت کمیٹی کی تجویز میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر تجربہ کے بعد یہ طریقہ مسلمانوں کیلئے مضر ثابت ہوا تو پھر کیا نتیجہ نکلے گا؟ کیا محض اس لئے کہ ایک مضر چیز دس برس کے بعد اختیار کی گئی۔مضر نہیں رہے گی۔مفید ہو جائے گی؟

۵۔ اگر کہا جائے کہ ہمارے یہ کہنے کا "دس برس کے بعد سے نشستوں کا تحفظ اڑا دیا جائے"۔یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سچ مچ دس برس کے بعد اس پر راضی بھی ہو جائیں گے۔یہ تو سیاسی معاملات میں مطلب برآری کا ایک ڈھنگ ہے۔جب دس برس کی مدت گزر جائے گی۔تو دیکھ لیا جائے گا کہ ہمیں منظور کرنا چاہیئے یا نہیں؟ تو اس اعتبار سے بھی یہ تجویز نہ صحیح تھی۔

اولاً کانسٹی ٹیوشن جیسے معاملہ میں جو ملک کا ازسرنو سیاسی ڈھانچہ ڈھال رہا ہے۔کسی جماعت کا ایک اصولی قاعدہ منظور کر لینا اور دل میں اسکے خلاف ارادہ رکھنا، ایک ایسا طرز عمل ہے۔جو نہ تو اصولاً جائز ہوسکتا ہے۔نہ عملاً مفید ہے۔اصولاً اس لئے نہیں کہ یہ صریح غلط بیانی اور فریب ہے۔عملاً اس لئے نہیں کہ خلافت کمیٹی کی تجویز کے بموجب دس برس کے بعد خود بخود تحفظ کی قید اڑ جائے گی۔

اس وقت مُسلمانِ پنجاب کس منہ سے یہ مطالبہ کرسکیں گے کہ ہمارے لئے آئندہ بھی نشستیں محفوظ رکھی جائیں جبکہ اس وقت صاف لفظوں میں دست برداری کا اعلان کر رہے ہیں اور اُسی دست برداری کی بنا پر دوسری جماعتوں سے ان کا معاہدہ ہو رہا ہے۔

ثانیاً، اگر کہا جائے۔کہ سیاسی معاملات میں اس طرح کے وعدے اور اعلانات کچھ کام نہیں دیتے۔اصلی چیز جماعت کی خواہش اور مطالبہ ہے۔ہم آج ہزار مرتبہ کہہ دیں۔کہ دس برس کے بعد سے تحفظ کا اٹھ جانا منظور ہے۔لیکن اگر دس برس کے بعد ہم نے

متفقہ طور پر فیصلہ کرلیا کہ آئندہ بھی تحفظ ہونا چاہیئے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس کے خلاف مجبور نہیں کرسکتی، تو پھر اس تجویز کی لغویت کا خود بخود فیصلہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہمیں اپنے عزم اور فیصلہ پر اعتماد ہے کہ آج یہ کہہ کر دس برس کے بعد اسے منظور کرلیں گے۔ دس برس کے بعد انکار کرسکتے ہیں۔ تو کیا آج صاف صاف یہ کہہ کر اور سب سے منوا کر کہ دس برس کے بعد تحفظ کا مطالبہ نہیں کرسکیں گے؟ اگر یہ کہہ کر آئندہ نہیں مانگیں گے، ہم آئندہ مانگ سکتے ہیں۔ اور لے سکتے ہیں۔ تو پھر کیا یہ کہہ کر ہم مانگیں گے اور حاصل کریں گے۔ آئندہ نہیں مانگ سکتے اور نہیں حاصل کرسکتے؟

﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ط﴾

۶۔ اگر کہا جائے کہ نہیں، ہمیں نہرو کمیٹی کی تجویز سے تو اتفاق ہے۔ لیکن ہم اپنے کمزوری اور بدنظمی دیکھتے ہوئے چاہتے ہیں کہ دس برس تک اپنے آپ کو منظم کرنے کی مہلت حاصل کرلیں تو اس لحاظ سے بھی یہ تجویز یکسر غلط تھی۔

اولاً۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اگر مجوزہ کانسٹی ٹیوشن پر اتفاق ہو جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کل ہی سے اس کا نفاذ شروع ہو جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہاں تک اور کب تک اس میں کامیابی ہو؟ پس اگر فی الحقیقت مسلمانان پنجاب کو اپنی تنظیم کی ضرورت ہے۔ تو اس کے لئے موجودہ مہلت سے جو یکسر ضائع ہو رہی ہے کیوں نہیں کام لیا جاتا؟ تنظیم کرنیوالی جماعتوں کانسٹی ٹیوشنوں کا انتظام نہیں کیا کرتیں۔

ثانیاً اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے خدع نفس اور فریب خیال کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ کہ وہ خیال کریں۔ ہم اپنی نشستیں محفوظ کر کے اپنی قوت منظم کرلیں گے ۔۔۔ اگر نشستیں محفوظ کرالی گئیں ۔ تو ممکن نہیں ۔۔۔ کہ مسلمانانِ پنجاب میں حقیقی انتخابی جدوجہد پیدا ہوسکے۔ کیونکہ پھر جدوجہد کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ جدوجہد انجمنوں کی تجویزوں سے نہیں پیدا ہوا کرتی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔ جس چیز کی بازار میں مانگ نہیں ہوگی، وہ مہیا بھی نہیں ہوگی۔ اگر فی الحقیقت مسلمانانِ پنجاب محسوس کرتے

ہیں۔ کہ انکی قوت کی راہ میں اصلی روک بدنظمی ہے۔ تو اس کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ کہ نشستوں کا عدم تحفظ پیچھے نہ ڈالیں۔ سب سے پہلے اختیار کریں تا کہ ان میں انتخابی جدو جہد کی پوری سرگرمی پیدا ہو سکے۔ اور ایک ایک نشست کے لئے وہ اپنی جانیں لڑا دیں۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ تو نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ دس برس تک مسلمان تو تحفظ کیوجہ سے بے فکر سوتے رہیں گے۔ اور دوسری جماعتیں عدم تحفظ کیوجہ سے ٹھوس بنیادوں پر اپنی انتخابی قوت منظم کر لیں گے۔ گیارہویں برس جب وہ چاہینگے کہ کروٹ بدلیں تو دیکھیں گے کہ دوسری جماعتوں نے تو اپنا انتخابی میدان پوری طرح منظم کر لیا ہے۔ مگر ان کے پاس مسلم لیگ کی بالا خوانیوں اور خلافت کمیٹی کی پر جوش تقریروں کے سوا کوئی سامان نہیں ہے!

بہرحال میرے خیال میں تجویز کسی لحاظ سے بھی صحیح نہ تھی بلکہ مسلمانانِ پنجاب کے لئے مضر تھی۔ میں نے دوسرے دن فرنگی محل کے پاس کھڑے کھڑے پنجاب کے دوستوں سے گفتگو کی اور ان سے کہا کہ رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں۔ اگر انہوں نے اس وقت تک اس معاملہ پر پوری طرح پر غور و فکر نہیں کیا ہے تو چاہیئے صاف صاف کہہ دیں۔ کہ سرِ دست ہم کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ہمیں مہلت ملنی چاہیئے۔ اگر وہ غور و فکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ نہرو کمیٹی کی تجویز غلط ہے تو چاہیئے دلائل پیش کریں۔ اور دلائل کی قوت پر فیصلہ چھوڑ دیں۔ اگر نفس تجویز سے اتفاق ہے۔ لیکن معاملہ کی اہمیت دیکھتے ہوئے دائمی فیصلہ کر دینا حزم و احتیاط کے خلاف سمجھتے ہیں تو صحیح طریقہ یہ ہے۔ کہ "ایڈلٹ سفرتج" کی شرط کے ساتھ دس سال کے لئے بطور آزمائش کے منظور کریں اور صاف اور قطعی لفظوں میں یہ بات طے کرالیں کہ اگر دس سال کے بعد انہوں نے چاہا تو تحفظ کے مطالبہ کا حق ہوگا۔

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنی جگہ فیصلہ کر لیا کہ :-

اب پنجاب کے دوستوں کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ بطور خود رائے قائم کریں۔ اور مجھے اس وقت تک اس میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ جس وقت تک کہ کوئی خاص ضرورت پیش نہ آئے۔

نمائندگانِ پنجاب:

۲۸ اور ۲۹ کو قیصر باغ میں کانفرنس کے بعد نمائندگانِ پنجاب کے جلسے ہوتے رہے۔ مگر میں شریک نہیں ہوا۔ ۲۹ کی شام کو ڈاکٹر کچلو نے مجھ سے کہا۔ کہ آج سکھ صاحبان کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی ہے۔ کہ پروپورشنل سیٹس اور "سنگل ٹرانسفریبل ووٹ" کا طریقہ منظور کرلیا جائے۔ تو تمام مشکلات دور ہوجائیں گی۔ مسلمان نمائندوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ غور کر کے کل صبح اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ اس موقع پر تمہاری شرکت بھی ضروری ہے۔

چونکہ میں "سنگل ٹرانسفریبل ووٹ" اور پروپورشنل سیٹس کے طریقے پر پہلے غور کر چکا تھا۔ اور میرے خیال میں پنجاب کے لئے یہ طریقہ موزوں نہ تھا۔ اس لئے میں نے ارادہ کرلیا کہ جلسہ میں شریک ہوں اور ضرورت ہو تو اپنی رائے ظاہر کردوں۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کو میں شریک ہوا۔ تقریباً تین گھنٹہ تک بحث جاری رہی بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ:۔

مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کی ایک مشترکہ کمیٹی بنالی جائے میں اس کی صدارت منظور کروں اور وہ کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کرلے میں نے اسے منظور کیا۔ لیکن کہا کہ تیج بہادر سپرد بھی شریک کرلئے جائیں چنانچہ وہ بھی شریک کرلئے گئے۔

اس دن کانفرنس سویرے ختم کردی گئی تاکہ پنجاب کمیٹی کو اجلاس کا موقعہ ملے۔ کمیٹی کی نِشست پانچ بجے سے نو بجے تک جاری رہی اور بالآخر تین چار گھنٹے کی گفت وشنید کے بعد جب مسلمان نمائندگانِ پنجاب نے ہر پہلو سے اپنی تشفی کرلی۔ تو وہ اس تجویز سے متفق ہوگئے۔ جس پر میں زور دے رہا تھا۔ اور جس سے ڈاکٹر سپرو بھی متفق ہوچکے تھے۔ یہ تجویز وہی ہے۔ جو کانگرس میں پیش کی گئی۔ اسمیں دو باتیں قطعی لفظوں میں واضح کردی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ فیصلہ ایڈلٹ سفریج کے ساتھ مشروط ہے۔ دوسرے یہ کہ صرف دس برس کے لئے منظور کیا جاتا ہے دس برس کے بعد پنجاب کو حق ہوگا۔ کہ اگر ضرورت محسوس کرے

تو تحفظ کا مطالبہ کر لے۔

مولانا شوکت علی:

پنجاب کمیٹی کی یہ کاروائی کوئی پوشیدہ کاروائی نہ تھی۔ کانفرنس میں پنجاب کمیٹی کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ علاوہ بریں جس وقت کمیٹی کا جلسہ شروع ہوا۔ تو مولانا شوکت علی کو بھی خبر دے دی گئی وہ تشریف لائے اور ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ کر مولوی عبدالقادر صاحب غازی عبدالرحمٰن صاحب او چوہدری افضل الحق صاحب سے باتیں کرتے رہے ان حضرات نے ان سے کہہ دیا تھا۔ کہ غور وفکر کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ جو تجویز اب پیش کی گئی ہے۔ یہ مسلمانانِ پنجاب کے حقوق کے لئے زیادہ محتاط اور اصلح ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نمائندگان پنجاب نے اسی رات کے جلسہ میں صاف صاف کہہ دیا تھا۔ کہ اگرچہ ہم نے مطمئن ہو کر ایک رائے قائم کر لی ہے۔ لیکن آخری فیصلہ کل صبح کریں گے۔ کیوں کہ ہم چاہتے ہیں۔ کہ بعض ان دوستوں سے بھی گفتگو کر لیں، جو اس وقت جلسہ میں موجود نہیں ہیں۔ دوستوں سے مقصود مولانا شوکت علی تھے۔ محض ان کے خیال سے آخری فیصلہ صبح تک ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن صبح کو جب یہ حضرات قیصر باغ میں آئے تو میں نے مولانا عبدالقادر صاحب سے دریافت کیا کہ شب کی گفتگو کا کیا نتیجہ؟ انہوں نے کہا کل رات کئی گھنٹے تک شوکت علی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے معلوم ہوتا کہ کیوں یہ تجویز مسلمانانِ پنجاب کیلئے مضر ہے؟ آخر میں انہوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی کہ معاملہ پنجاب کا ہے۔ اصلی ذمہ داری آپ لوگوں کی ہے۔ اگر آپ مطمئن ہیں۔ تو یہ تجویز منظور کر لیجیے۔

واقعی بات بھی یہی تھی مرکزی خلافت کے جلسہ میں ۲۶ اکتوبر کو جو تجویز قرار دی گئی تھی۔ وہ محض اس لئے قرار دی گئی تھی۔ کہ ارکانِ پنجاب کی اکثریت کی رائے تھی۔ اب اگر انہوں نے چار دن کے غور وفکر کے بعد محسوس کر لیا ہے۔ کہ دوسری تجویز اس سے بہتر

ہے۔تو کوئی وجہ نہیں ہے۔کہ مرکزی خلافت کمیٹی کو پچھلی تجویز پر اصرار ہو جب کبھی مختلف انجمنیں ملکر متفقہ کسی فیصلہ تک پہنچنا چاہتی ہیں۔تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔کہ ہر انجمن اپنی جگہ فیصلہ کے لئے تجاویز قرار دیتی رہتی ہے۔اور بالآخر کسی ایک تجویز پر سب کا اتفاق ہو جاتا ہے۔

کانفرنس میں جب پنجاب کا فیصلہ کیا گیا۔تو ہم میں سے کوئی شخص بھی اس بات کا متوقع نہ تھا۔کہ مولانا شوکت علی اس کی مخالفت کریں گے۔پنجاب کے تمام حضرات مطمئن تھے۔کہ مولانا شوکت علی شخصی طور پر کوئی خاص کاوش نہیں رکھتے۔انکی تمام کوشش اس لئے تھی۔کہ پنجاب کے نمائندوں کے فیصلہ کی حمایت کریں اب اگر انہوں نے مطمئن ہو کر فیصلہ کرلیا ہے۔تو قدرتی طور پر وہ ان کا ساتھ دیں گے۔لیکن یکا یک وہ پلیٹ فارم پر آئے اور انہوں نے مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے ایک اعلان پڑھا۔ان کا خلاصہ یہ تھا۔ اگرچہ نمائندگان پنجاب نے فیصلہ کرلیا ہے۔لیکن خلافت کمیٹی اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ قدرتی طور پر لوگوں کو اس پر تعجب ہوا۔ڈاکٹر محمد عالم صاحب نے پوچھا کہ کیا یہ اعلان مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسہ میں قرار پایا ہے؟ اور مولوی عبدالقادر صاحب نے انہیں وہ گفتگو یاد دلائی جو کل رات اس بارے میں ہو چکی تھی۔واقعہ یہ ہے۔کہ نہ تو خلافت کمیٹی کا یہ اعلان تھا۔اور نہ اس گفتگو کے بعد جو ارکان پنجاب سے ہو چکی تھی۔اس مخالفت کا کوئی محل باقی رہا تھا۔لیکن مولانا شوکت علی نے ان تمام سوالوں کا جواب یہ دیا۔کہ میں بے ایمان نہیں ہوں تم سب بے ایمان ہو!

قصہ کوتاہ گشت ورنہ دردسر بیار بود

اسی دن نمائندگانِ پنجاب وسندھ نے کوشش کی کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب کیا جائے۔جس کے اجلاس اس وقت جاری تھے۔لیکن اس سے انکار کر دیا گیا۔اور مولانا شوکت علی لکھنؤ سے روانہ ہو گئے۔

ان تمام واقعات کے پڑھنے کے بعد ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے۔کہ مولانا شوکت علی کا یہ طرز عمل کس درجہ دیانت داری کے خلاف ہے۔کہ وہ فیصلہ پنجاب کے ان صاف اور

سادہ واقعات کیطرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔ گویا یہ ایک مجرمانہ سازش تھی جس کی داستان بڑی ہی طویل ''اور درد انگیز'' ہے جہاں تک پہلے وصف یعنی طوالت کا تعلق ہے۔ یقیناً ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ کیوں کہ بہر حال جو کچھ پیش آیا وہ کوئی مختصر واقعہ نہیں تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسمیں درد انگیزی کی کونسی بات ہے؟ اگر درد انگیز ہونے سے یہ مقصود ہے کہ ارکانِ پنجاب کا اتفاق شخصی طور پر ان کے لئے درد انگیز ہوا تو یہ بہر حال ان کے لئے ذاتی احساسات کا معاملہ ہے اور اس کیلئے دنیا کو زحمت ماتم نہیں دینی چاہیئے۔ لیکن درد انگیزی سے مقصود یہ ہے۔ کہ یہ معاملہ اپنی نوعیت میں درد انگیز تھا۔ تو خدارا شوکت علی صاحب ہمیں بتلائیں ایک ذمہ دار جماعت کے پانچ دن تک بحث و مباحثہ کرنے اور اسکے ایک خاص تجویز سے اتفاق کر لینے میں درد انگیزی کی بلا کہاں سے آ گئی؟ آخر پر جوش ہونیکے یہ معنی تو نہیں ہونے چاہئیں۔ کہ عقل و دماغ سے بالکل قطع نظر کر لیا جائے؟ ہمیشہ اس طرح کے معاملات میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کہ جب تک ایک معاملہ بحث و تفصیل میں آ کر پوری طرح واضح نہیں ہو جاتا۔ لوگ اختلاف کرتے ہیں۔ جب کوئی ایسی صورت نکل آتی ہے۔ تو طبیعتیں مطمئن اور اتفاق کر لیتی ہیں۔ مگر نظر ہمیشہ حقیقت اور دلائل پر رکھنی چاہیئے۔ اور دیکھنا یہ چاہیئے۔ کہ جس چیز پر اتفاق ہوا ہے۔ وہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر غلط ہے تو دلائل سے غلطی واضح کرنی چاہیئے۔ یہ وعدہ کلیہ کہاں سے نکل آیا۔ کہ ہر بات جو مولانا شوکت علی کی رائے کے مطابق ہوئی ہو۔ ایک مقدس عمل ہے۔ اور ہر بات جو ان کی رائے کے مخالف ہوئی ہو گناہ و جرم ہے؟

مولانا شوکت علی کہتے ہیں۔ کہ ''پنجاب کے فیصلہ کے ذریعہ خلافت کمیٹی کو قابل مضحکہ بنانا چاہا۔'' میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ بھی منجملہ اُن باتوں کے ہے جن کا مطلب سمجھنے سے میری سمجھ عاجز ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ جب کبھی مختلف جماعتیں کسی مشترک موقعہ پر شریک ہوتی ہیں۔ تو آخری فیصلہ سے پہلے اپنی اپنی جگہ مختلف رائیں قائم کرتی رہتی ہیں۔ بالآخر کسی ایک صورت پر سب کا اتفاق ہو جاتا ہے اس میں تضحیک اور بے وقتی کی کونسی بات

ہے؟ مرکزی خلافت کمیٹی نے پہلے ہی اس بات کا فیصلہ کر دیا تھا۔ کہ معاملہ پنجاب کا ہے۔ اور پنجاب کے ارکان پر چھوڑ دینا چاہیئے پنجاب کے ارکان کی اکثریت نے ایک تجویز اختیار کی لیکن چار دن کے غور و بحث کے بعد انہوں نے محسوس کیا۔ کہ اس تجویز سے زیادہ بہتر اور محتاط تجویز اختیار کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اس پر متفق ہو گئے۔ انہوں نے آخری فیصلہ سے پہلے مولانا شوکت علی صاحب سے گفتگو کر لی۔ اور تمام وجوہ اور دلائل بیان کر دیئے۔ قدرتی طور پر جو صورت سمجھی گئی۔ وہ یہی تھی کہ اب خلافت کمیٹی کو ان کے خلاف کوئی کاوش نہیں ہے۔ اور نہ ہونی چاہیئے محض ایک ضابطہ کی کاروائی باقی رہ گئی ہے۔ کہ دوسرے دن کمیٹی کا جلسہ کر کے اس میں یہ معاملہ صاف کر دیا جائے گا۔ اس طرح کی کاروائیاں ہمیشہ کانفرنسوں میں ہوتی ہیں۔ اور کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزرتی کہ اس میں کوئی تضحیک یا بے عزتی کی بات ہے۔

شوکت علی اور کانفرنس:

قدرتی طور پر ایک سوال ہر شخص کے سامنے آئے گا۔ مولانا شوکت علی کہتے ہیں کہ کانفرنس کی تجویزوں نے مسلمانوں کا قتل عام کر دیا۔ اور یہ ایک ہولناک سازش تھی۔ جو چار مہینوں سے جاری تھی۔ اور انہیں اول دن سے تمام حالات معلوم تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر فی الحقیقت صورت ایسی ہی تھی تو لکھنؤ کانفرنس چار دن تک ہوتی رہی۔ وہ کیوں یک قلم خاموش رہے؟ کیوں انہوں نے پہلے ہی دن اعلان کر دیا۔ کہ "میں ایک لفظ ایسا نہیں کہوں گا۔ جس سے نہرو کمیٹی کی رپورٹ کو نقصان پہنچے۔" یقیناً انہیں لکھنؤ اسلئے نہیں جانا تھا۔ کہ مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہے اور وہ خاموش بیٹھ کر نظارہ کریں؟ کم سے کم انہیں ان مسائل کی نسبت دلائل و وجوہ تو بیان کر دیئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ بات جو ہوتی تھی وہ یہی تھی۔ کہ کانفرنس اتفاق نہ کرتی۔ نہ کرے وہ اپنے فرض سے تو بری الذمہ ہو جاتے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ نہ صرف مولانا شوکت علی کا یہ نالہ و شیون' بلکہ ان کے تمام بیان کردہ تاثرات بھی بعد از وقت ہیں۔ اور ان کا سرچشمہ لکھنؤ کانفرنس میں نہیں بلکہ

دوسرے گوشوں میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ مشکل یہ ہے کہ میں نفسِ مباحث سے ہٹ کر کسی ایسی راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ جہاں سے ذاتیات کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ میرے شناسا جانتے ہیں۔ کہ شخصی طور پر مولانا شوکت علی کے جواب میں ان اوراق کا سیاہ کرنا بھی کس درجہ میری طبیعت کی افتاد کے خلاف ہے؟ اگر مولانا شوکت علی کے غیر متوقع اور ناگہانی طرزِ عمل نے مجبور نہ کر دیا ہوتا' تو ممکن نہ تھا۔ کہ اس طرح کے مخاطبات سے قلم آلودہ کرتا۔ پس میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ صرف واقعات کے بیان کر دینے پر اکتفا کروں۔ اور باقی تمام باتوں سے قطع نظر کر لوں:۔

فَبَشِّرْ عِبَادَالَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ
اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ وَاُوْلٰٓئِکَ هُمْ اُوْلُوا الْاَ لْبَابِ
(آیت نمبر 18-17 سورۃ زمر)

صدر کانفرنس کے طرزِ عمل کی نسبت جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ وہ اس امر کی واضح مثال ہے۔ کہ جب کبھی اختلاف رائے معاندانہ مخالف شکل اختیار کر لیتا ہے تو کس طرح حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ اور جو چیز ایک شخص کی نظروں میں سفید ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کو سیاہ نظر آنے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان عقل و دماغ سرتاسر جذبات کی مخلوق ہے۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلة
کما ان عین السخط تبدی الما دیا

ابھی کانفرنس شروع نہیں ہوئی تھی کہ میں نے محسوس کیا' دو باتوں کا طے کر لینا نہایت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ کانفرنس میں مسائل کا فیصلہ کیوں کر کیا جائے گا؟ دوسری یہ کہ مختلف جماعتوں کا جو کچھ بھی اتفاق ہوگا۔ اس کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ ہوگی کہ ایک مجموعی چیز پر اس کی مجموعی حیثیت میں اتفاق ہوا ہے۔ یا ایسا ہونا ضروری نہ ہوگا؟

پہلی بات کی ضرورت واضح تھی۔ آل پارٹیز کانفرنس اگرچہ مختلف انجمنوں اور جماعتوں

کے نمائندوں سے مرکب تھی۔لیکن ان میں بجز ایک جماعت کے (یعنی لبرلز کے اور کوئی جماعت اس پوزیشن میں نہ تھی کہ اپنی انجمن میں نہرو رپورٹ کی نسبت کوئی باضابطہ تجویز منظور کرکے آئی ہو۔اکثروں کی حیثیت یہی تھی۔کہ وہ اپنی اپنی انجمنوں کی طرف سے کانفرنس میں جمع ہوئے تھے۔اور چاہتے تھے۔کہ حتی الوسع ایک متفقہ نتیجہ تک پہنچ جائیں اور پھر اپنی اپنی انجمنوں سے اسے باضابطہ منظور کرائیں علاوہ بریں یہ بات بھی ظاہر تھی۔کہ کانسٹی ٹیوشن میں اتفاق جماعتوں کا مطلوب تھا نہ کہ انفرادی حیثیت سے کسی خاص اجتماع کا۔

پس اگر کانفرنس کے فیصلوں کی نوعیت واضح نہ کر دی جاتی اور مختلف جماعتوں کے لئے حق اختلاف تسلیم نہ کرلیا جاتا۔تو طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتیں تھیں۔مثلاً جہاں تک فرقہ وار مسائل کا تعلق ہے۔مسلمان کہہ سکتے تھے کہ کانفرنس میں ان کی انجمنوں کے کتنے ہی نمائندے شریک ہوئے ہوں۔لیکن بہرحال ان کی تعداد ہندو شرکاء سے بہت کم ہے۔اور اس لئے اگر صرف کانفرنس کی اکثریت ہی پر ان مسائل کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔تو ظاہر ہے کہ اکثریت ہر حال میں ان کے خلاف فیصلہ کرے گی۔اسی طرح سکھوں کی طرف سے بھی اعتراض کیا جاسکتا تھا۔

دوسری بات پہلے سے بھی زیادہ اہم تھی۔یہ ظاہر ہے کہ کانفرنس کے سامنے جو مسائل فرقہ وار مطالبات کی شکل میں پیش ہوئے تھے۔وہ اکثر حالتوں میں ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔نہرو کمیٹی نے جو تجاویز پیش کی ہیں۔وہ بھی ایسی ہیں۔کہ ایک تجویز کا اثر دوسری تجویز پر پڑتا ہے۔اگر اصولی طور پر یہ بات طے نہ کر دی جاتی کہ جو کچھ بھی یہاں فیصلہ ہوگا۔وہ مجوزہ کانسٹی ٹیوشن کی مجموعی حیثیت سے ہوگا۔اور یہ جائز نہ ہوگا۔

کہ ایک جزو دوسرے سے الگ کرکے کام میں لایا جائے تو طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی تھیں اور کانفرنس کے فیصلہ کا غلط استعمال کیا جاسکتا تھا مثلاً رپورٹ نے جہاں اس بات پر زور دیا ہے کہ بنگال اور پنجاب کے لئے نشستوں کے تحفظ کی ضرورت نہیں

وہاں اس بات پر بھی زور دیا ہے۔ ایڈٹ سفرتج کا طریقہ نافذ کرنا چاہیئے۔ اب یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے پہلی بات منظور کر لی تو قدرتی طور پر انہیں اس بات کی طرف سے بھی اطمینان ہونا چاہیئے۔ کہ آئندہ چل کر ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہ ایڈلٹ سفرتج نافذ نہ ہو اور بنگال و پنجاب میں نشستوں کا تحفظ اڑا دیا جائے۔

چنانچہ ۲۸ اگست کی صبح کو جب کانفرنس کی تجاویز لکھی جا رہی تھیں میں نے ان دونوں باتوں کا ذکر کیا۔ اور سب نے اس سے اتفاق کیا۔ پہلی بات کا انحصار ڈاکٹر صاحب پر تھا۔ کیونکہ وہی کانفرنس کے صدر تھے۔ انہوں نے کہا۔ کہ وہ کانفرنس میں اعلان کر دیں گے۔ کہ اگر فرقہ وار مسائل میں سے کسی مسئلہ کا بالاتفاق فیصلہ نہ ہوسکا۔ اور کانفرنس کے شرکا کی رائیں لی گئیں۔ تو یہ رائیں انفرادی حیثیت سے لی جائیں گی۔ اور مقصود صرف یہ ہوگا کہ کانفرنس کا رجحان عمومی معلوم کر لیا جائے۔ علاوہ بریں جس قدر رائیں مختلف جماعتوں کی طرف سے مخالفت یا ترمیم و تغیر کی پیش کی جاسکتی ہیں وہ لکھ کر پیش کر دی جائیں۔ کانفرنس انہیں اپنی رپورٹ کے ساتھ کمیٹی کے حوالے کر دے گی۔ تا کہ ان پر غور و فکر کیا جائے۔

فی الحقیقت یہ ایسا طرز عمل تھا۔ جس سے زیادہ محتاط طرز عمل اس موقع پر نہیں ہوسکتا چنانچہ ۲۹ کو ڈاکٹر صاحب نے اس کا اعلان کر دیا۔ اور اسی بنا پر جو یاداشتیں مسلم لیگ کی سب کمیٹی، خلافت کمیٹی جمیعت العلماء اور غالباً انڈین کرسچیز کیجانب سے پیش کی گئی تھیں وہ سب درج کر لی گئیں اور آخری دن اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

دوسری بات کی نسبت مجھے یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی تھی کہ میرے کہنے سے پہلے ہی پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی ضرورت محسوس کر لی تھی۔ اور ایک تجویز کا مسودہ بھی تیار کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوگئی۔ اس تجویز میں یہ بات صاف کر دی گئی۔ کہ مختلف جماعتوں کا جو کچھ بھی اتفاق ہوا ہے۔ وہ مجوزہ کانسٹی ٹیوشن کی مجموعی نوعیت پر ہوا ہے۔ آئندہ اگر اس کے کسی خاص جز میں تبدیلی ہوئی یا نفاذ میں نہ آسکا۔ تو جب تک متفقہ جماعتیں ازسرنو منظوری نہ دیدیں۔ کانسٹی ٹیوشن لائق احتجاج نہ ہوگا۔

یہ دونوں باتیں فی الحقیقت مسلمانوں کے تحفظ کیلئے سب سے زیادہ ضروری تھیں۔لیکن اب سنیئے۔ہمارے عقلاء سیاست کے فہم و دیانت کا کیا حال ہے؟ بیان کیا جاتا ہے کہ:۔

یہ ساری باتیں اس لئے کی گئیں۔تا کہ مسلمانوں کے حقوق پامال کئے جائیں۔ اگر پوچھا جائے۔کہ یہ دونوں باتیں جو صریحاً مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کیلئے ہیں۔پامالی حقوق کی سازش کس طرح بن گئیں؟ تو مصیبت یہ ہے۔کہ کیوں اور کس لئے کی اس دانش آباد سیاست اور عقلستان فہم وراست میں گنجائش ہی نہیں ہے۔

مُسلمانوں کا قتل عام: مولانا شوکت علی لکھتے ہیں:۔

جس طرح مسلمان نمائندوں کی تحریکوں اور ترمیموں کی ساتھ سلوک کیا گیا۔وہ کوئی ناپسندیدہ غیر مسلم بھی نہیں کرے گا۔"

ہمیں یہاں اس قاعدہ کے ماتحت کہ مولانا شوکت علی کی روایت میں واحد و جمع اور قلیل و کثیر کا فرق چنداں اہمیت نہیں رکھتا' یہ بات پہلے صاف کر دینی چاہیئے۔کہ کانفرنس میں " مسلمان نمائندوں " نے تحریکیں اور ترمیمیں " پیش نہیں کی تھیں۔ بلکہ صرف ایک نمائندہ نے پیش کی تھی۔یعنی مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی نے' میں امید کرتا ہوں کہ مولانا شوکت علی کو کم از کم اس مسئلہ میں اختلاف نہ ہوگا۔کہ دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو میں بھی واحد اور جمع کا صیغہ ایک نہیں ہے۔اور جب کبھی کہا جائے کہ بہتوں نے یہ بات کہی اور واقعہ یہ ہو کہ صرف ایک نے کہی ہو تو عموماً لوگ اسے غیر صحیح قرار دینے کی غلطی کہا کرتے ہیں۔

لیکن معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔یہ تو محض انکے جوشِ بیاں کی ابتدا تھی۔ بہت جلد انہوں نے محسوس کر لیا کہ جسقدر کہا گیا ہے۔کافی نہیں ہے۔چنانچہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

"جو برتاؤ مسلمان جماعتوں اور مسلمان مقرروں کے ساتھ کانفرنس میں کیا گیا۔ اس کی مثال یہی تھی۔جو میں نے بارہا اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھی تھی۔جب کہ میں

انگریزوں کا ملازم تھا۔ اور تیس چالیس رامپور کے گرے ہاؤنڈ رکھتا تھا۔ جو برتاؤ وہ شکاری گرے ہاؤنڈ ایک لومڑی یا گیدڑ کے ساتھ کرتے تھے۔ وہی یہاں مسلماں مقرروں اور مسلمان تجویزوں (یعنی مسلمانوں کی تجویزوں) کے ساتھ کانفرنس کے اجلاس میں نظر آیا۔"

اس اسلوب بیان کی متانت و اعتدال کی نسبت میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اور نہ اس تمثیل مرکب کی خوبی و لطافت محتاج بیان ہے۔ البتہ واقعہ کی صحت کیلئے یہاں بھی اس قدر اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ کہ اس شکار گاہ کی جن لومڑیوں" اور " گیدڑوں' کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اگر چہ بصیغہ جمع ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے بصیغہ واحد ہی سمجھنا چاہیئے۔

بہر حال اب غور کرنا چاہیئے کہ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی نے کانفرنس میں چار ترمیمس پیش کی تھی:۔

(۱) انڈین کامن ویلتھ کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ جو اردو ہندی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔

(۲) اگر کسی وجہ سے "ایڈلٹ سفریج" نافذ نہ ہوسکا۔ تو پھر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔ جس سے ہر جماعت کو اس کی آبادی کے مطابق حقِ رائے دہندگی مل جائے۔

(۳) رپورٹ میں اقلیتوں کیلئے نشستوں کا تحفظ دس برس کے لئے رکھا گیا ہے۔ اس کی جگہ یہ کر دیا جائے گا کہ "اس وقت تک تحفظ کیا جائیگا۔ جس وقت تک اقلیتیں مطالبہ کریں۔"

(۴) مرکزی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں محفوظ کردی جائیں۔

ان میں سے پہلی ترمیم انہوں نے کانفرنس میں پیش کی اور منظو ہوگئی۔ بلکہ وہ تو

تیار ہو گئے تھے۔ کہ بغیر کسی اصولی فیصلہ کے اپنی ترمیم کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے حوالے کر دیں۔ لیکن میں نے انہیں باصرار روکا' اور سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کو آمادہ کیا۔ کہ وہ اس ترمیم کی جگہ ایک مفصل تجویز بنا کر پیش کر دیں تاکہ اصول طے ہو جائیں۔ اور صرف تفصیلات کا انضباط باقی رہ جائے۔ چنانچہ تجویز تیار کی گئی اور مولوی صاحبان اپنی ترمیم کی جگہ اسے تسلیم کر لیا۔ اور اصل نہرو کمیٹی نے یہ بات طے کر لی تھی۔ کہ مرکزی زبان ہندوستانی ہوگی۔ اور دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ لیکن بڑی مشکل مختلف صوبوں کی مقامی زبانوں نے پیدا کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی صوبہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ کہ اپنی مقامی زبان ترک کر دے پس اس کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ:۔

تمام صوبوں کی اپنی اپنی مقامی زبانوں کا اختیار دیا جائے۔ اور ساتھ ہی ایک مرکزی اور انٹر پراونشل زبان بھی تسلیم کر لی جائے یہ زبان بجز ہندوستانی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

ویز میں یہ تمام باتیں بطور مبادیات کے تسلیم کر لی گئی ہیں۔

البتہ دوسری اور تیسری ترمیم میں مسٹر چھاگلا اور بعض دیگر اصحاب نے اعتراض کیا کہ آؤٹ آف آرڈر ہیں۔ اور صدر مجلس نے کانفرنس کی رائے لے کر انہیں ایسا ہی قرار دیا۔ یہی دو ترمیمیں ہیں جو پیش نہ ہو سکیں۔ یہی وہ معاملہ ہے۔ جسے مولانا شوکت علی "صدر مجلس کا ایسا سلوک جو ناپسندیدہ ہندو صدر بھی نہ کرتا" اور "مسلمانوں کا قتل عام" اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ قرار دے رہے ہیں۔ میں یہاں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کہ دونوں ترمیمیں آؤٹ آف آرڈر تھیں یا نہ تھیں؟ ڈاکٹر انصاری اس بارے میں مفصل بیان شائع کر چکے ہیں اسکے بعد کسی مبحث کی ضرورت نہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیتا ہوں کہ صدر کا فیصلہ صحیح نہ تھا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا واقعی یہ دو ترمیمیں ایسی تھیں۔ جو صرف مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے آؤٹ آف آرڈر قرار دے دی گئیں۔ اور ان کا پیش نہ ہو سکنا مسلمانون کا قتلِ عام اور لومڑیوں اور گیدڑوں کا شکار ہو گیا؟

ان دونوں ترمیموں میں سے پہلی ترمیم یہ تھی کہ:۔

اگر ایڈلٹ سفریج نافذ نہ ہوا۔ تو پھر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ کہ ہر جماعت کا حق رائے دہندگی اس کی آبادی کے تناسب کے مطابق رہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس ترمیم میں جس اصول کا مطالبہ کیا گیا ہے بالکل صحیح ہی لیکن سوال یہ ہے۔ کہ بنگال اور پنجاب کے فیصلوں کے بعد اس کی ضرورت کیا باقی رہی تھی؟ اگر اس بات کا فیصلہ کانفرنس میں نہ ہوا تو اس سے مسلمانوں کا نقصان کیا ہوگا؟ بنگال اور پنجاب نے اپنے اتفاق میں یہ بات صاف اور قطعی طور پر واضح کر دی ہے۔ کہ وہ صرف اس شرط پر اس سال کے لئے تحفظ کا نہ ہونا منظور کرتے ہیں۔ کہ ایڈلٹ سفریج نافذ کیا جائے۔ اگر ایڈلٹ سفریج نافذ نہ ہوسکا۔ تو پھر وہ اس سے متفق بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مولوی مجیب الرحمٰن صاحب سیکرٹری بنگال پراونشل مسلم لیگ نے جو تار بھیجا تھا۔ اس میں بھی یہ شرط صاف لفظوں میں واضح کر دی گئی ہے علاوہ بریں کانفرنس نے ایک خاص تجویز منظور کر کے یہ بات بطور اُصول کے تسلیم کر لی ہے۔ کہ یہاں جو کچھ بھی اتفاق ہوا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ہوا ہے۔ یہ بات جائز نہ ہوگی۔ کہ کوئی ایک بات دوسری باتوں سے الگ کر کے کام میں لائی جائے پھر مسلمانوں کو اندیشہ کس بات کا ہے۔ کیا اس بات کا ہے۔ کہ ایڈلٹ سفریج نافذ نہ ہوا تو ہم کیا کریں گے؟ ظاہر ہے۔ کہ اس صورت میں نشستوں سے دست برداری بھی نہ ہوگی۔ قصہ ختم ہوا۔ خواہ مخواہ ہم اسی وقت سے اس فکر میں دبلے ہونا کیوں شروع ہو جائیں کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اگر اس وقت بھی دوسری جماعتوں نے اصرار کیا کہ بنگال و پنجاب میں تحفظ ہو۔ تو یہ اُن کا فرض ہوگا۔ کہ وہ کوئی دوسری صورت ایسی پیش کریں جو مسلمانوں کیلئے لائق قبول ہو۔ مسلمان کیوں اس فکر میں ابھی سے سر کھپائیں؟

دوسری ترمیم جو پیش نہ ہوسکی، یہ تھی کہ اقلیتوں کے لئے نشستوں کا تحفظ اس وقت تک قائم رکھنا چاہیئے۔ جس وقت تک وہ مطالبہ کریں میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ترمیم ایک معقول ترمیم تھی۔ اور اگر کانفرنس میں کسی میکینکل سبب سے اس پر بحث نہ ہوسکی۔ تو کوئی مضائقہ نہیں ضروری ہے۔ کہ اس پر زور دیا جائے اور ضروری ہے کہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اس پر

غور کرے۔ کانسٹی ٹیوشن جیسے اہم معاملہ میں کوئی بات محض اس لئے چھوڑ نہیں دی جا سکتی۔ کہ بعض ٹیکنیکل رکاوٹوں سے وہ باقاعدہ کانفرنس میں پیش نہ ہو سکی۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ صوبوں کی اقلیتوں کا سوال صوبوں کی اکثریتوں سے بالکل مختلف ہے۔ اور اگر ایک صوبے کی اقلیت مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی نشستیں محفوظ ہونی چاہئیں۔ تو اکثریت کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ کہ صرف دس برس تک ہی نشستیں محفوظ کی جائیں گی۔ گیارہویں برس سے اقلیت کو اکثریت پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ جماعتوں کا اعتماد سوڈا واٹر کی بوتل نہیں ہے کہ جبراً کسی کے حلق میں انڈیل دیا جائے۔ وہ تو دلوں کے اطمینان اور یقین کی ایک حالت ہے۔ جو خاص طرح کے احوال وظروف ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ پس صحیح طرز عمل جو اس بارے میں ہو سکتا ہے۔ یہی ہے۔ کہ یہ بات اقلیتوں پر چھوڑ دینی چاہیئے۔ جس وقت تک وہ خود دست بردار نہ ہونا چاہیں۔ انہیں مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا کیا گیا اور وہ حالات پیدا ہو گئے۔ جو آئندہ متوقع ہیں۔ تو بہت ممکن ہے کہ اقلیتیں مطمئن ہو کر خود بخود اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ تحفظ کی قید باقی نہ رکھی جائے۔

بہر حال جہاں تک اس ترمیم کے مطلب کا تعلق ہے۔ میں نہ صرف اس سے متفق ہوں۔ بلکہ کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ کیوں ایسا نہ کیا جائے؟ لیکن جو سوال یہاں درپیش ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اگر صدر کانفرنس نے کسی گزشتہ تجویز سے غیر مطابق قرار دے کر اسے آؤٹ آرڈر قرار دے دیا تو کیا یہ اس لئے تھا۔ کہ مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچایا جائے؟ یا مولانا شوکت علی کے معتدل لفظوں میں "مسلمانوں کا قتل عام" کیا جائے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص بھی جس نے عقل وانصاف کا سررشتہ بالکل چھوڑ نہ دیا ہو، اسے باور کر سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس معاملہ کا تعلق صوبوں کے اقلیتوں سے تھا۔

اور صوبوں کی اقلیتوں میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ ہندو اور مسلمان' دونوں ہیں۔ اگر یو۔ پی اور بہار وغیرہ میں مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ تو ٹھیک اسی طرح سندھ اور سرحد میں ہندوؤں کو بھی اسکی ضرورت ہوسکتی ہے۔ جو کچھ بھی فیصلہ ہوگا۔ دونوں کے لئے ہوگا۔ نہ کہ صرف مسلمانوں کے لئے۔ پھر اگر یہ ترمیم آؤٹ آف آرڈر قرار دے دی گئی۔ تو اس میں خاص مسلمانوں کے قتلِ عام کی سازش کہاں سے پیدا ہوگئی؟ اور مولانا شوکت علی کے "رامپوری گرے ہاؤنڈ "اور "لومڑیوں " اور " گیدڑوں "کے شکار کے لطیف تخیل کیوں کر وجود میں آ گیا؟

میں یہاں یہ بات ظاہر کر دینی چاہتا ہوں کہ اگر چہ کانفرنس میں یہ ترمیم اس لئے پیش نہ ہوسکی۔ کہ بعد از وقت پیش کی گئی۔ اور جو صحیح وقت پیش کرنے کا تھا اس وقت کسی کو خیال نہیں ہوا۔ تاہم میں نے اپنی جگہ یہ بات صاف کر لی تھی۔ کہ اس بارے میں کوئی تشویش نہیں ہونی چاہیئے۔ دوسرے دن جب مولوی محمد شفیع صاحب مجھ سے ملنے میری قیام گاہ پر آئے۔ تو میں نے ان سے بھی یہ بات کہہ دی تھی۔ کہ جہاں تک کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبروں کا تعلق ہے مجھے معلوم ہے کہ اس بارے میں انہیں کوئی کاوش نہیں ہے اور چونکہ اب کانسٹی ٹویشن کا مسودہ پھر کمیٹی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئیگی۔ کہ دس بارہ کی قید اٹھا دی جائے۔ میں اب بھی پورے اطمینان خاطر کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ علاوہ بریں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی طرف سے ایک یادداشت کانفرنس کر دی گئی۔ جس کو دوسری انجمنوں کی یادداشتوں کے ساتھ کانفرنس نے ریکارڈ کر لیا ہے۔ اس میں بھی

اس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ دس برس کی قید اٹھا دی جائے۔ پس جہاں تک ہمارے مطالبات کا تعلق ہے۔ کانفرنس کے سامنے۔ یہ مطالبہ آ چکا ہے۔

مولوی شفیع صاحب داؤدی کی چوتھی۔ ترمیم مرکزی مجلس میں ایک تہائی نیابت کی نسبت تھی۔ لیکن نہیں معلوم کیوں۔ خود مولوی صاحب نے اسے پیش کرنا پسند نہیں کیا۔ چنانچہ جب صدر نے انہیں بلایا کہ ترمیم پیش کریں۔ تو معلوم ہوا' وہ کانفرنس میں موجود نہیں ہیں۔

اصولِ روایت:

اس تمام سرگزشت کے پڑھنے کے بعد ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ مولانا شوکت علی کے بیانات کہاں تک اصلیت وحقیقت پر مبنی ہیں؟ وہ کہتے ہیں:۔

"صدر کانفرنس نے مسلمان مقرروں اور انکی تحریکوں اور ترمیموں کے ساتھ جو سلوک کیا۔ وہ کوئی ناپسندیدہ ہندو بھی نہیں کرے گا۔"

پھر لکھتے ہیں:۔

جو سلوک رامپور کے تیس چالیس گرے ہاونڈ لومڑی یا گیدڑ کے ساتھ کرتے تھے۔ وہی سماں مسلمان مقرروں اور مسلمانوں کی تجویزوں کے ساتھ نظر آتا تھا۔"

پھر اتنے ہی پر بس کرتے۔ بلکہ اس معاملہ کو "مسلمانوں کا قتل عام" قرار دیتے ہیں" اور یہ تعبیر ان کے لئے ایک ایسی مسلمہ اور طے شدہ تعبیر ہو جاتی ہے کہ جب کبھی ان ترمیموں کے معاملہ کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ تو ترمیموں کے لفظ کی جگہ یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

جب مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ تو مجھ سے ایک آدمی نے کہا۔" اور جب مسلمانون کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ تو فلاں آدمی نے فلاں آدمی سے یہ بات کہی"

گویا ترمیموں کے معاملہ کا قتل عام ہونا ایک ایسی بات ہے جیسے شہد کا غسل ہونا۔ لیکن پھر جب دریافت کیا جاتا ہے۔ کہ آخر کانفرنس کا وہ کونسا واقعہ ہے۔ جسکی وجہ سے یہ سب کچھ ظہور میں آ گیا؟ تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف واقعہ یہ ہے۔ کہ ایک صاحب نے چار

ترمیمیں پیش کرنی چاہی تھیں۔ایک پیش ہوئی اور منظور کر لی گئی۔ایک سے وہ دست بردار ہو گئے۔دو ترمیمیں خلاف قاعدہ قرار دی گئیں۔جن میں سے پہلی ترمیم تو قطعاً مسلمانوں کے مفاد کے لئے ضروری تھی۔اور دوسری بھی ایسی نہ تھی جو خاص مسلمانوں کے مفاد سے تعلق رکھتی تھی۔جو کچھ بھی ہو اس کے پیش نہ ہو سکنے سے اصل مسئلہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کیونکہ مسلم لیگ کی سب کمیٹی اپنی یادداشت میں اس پر زور دے چکی ہے۔اور وہ کانفرنس نے ریکارڈ کر لی ہے!

اچھا تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیجئے۔کہ ان دو ترمیموں کو "آؤٹ آف آرڈر" قرار دینے میں صدر کانفرنس کا فیصلہ صحیح نہ تھا۔اور مولانا شوکت علی کی رائے میں یہ بات نہایت ضروری تھی۔کہ اس کے خلاف خامہ فرسائی کریں۔ہر شخص کہے گا کہ یقیناً کر سکتے ہیں۔لیکن یہ کہاں کی دیانت اور راست بازی ہے۔کہ صرف اتنی سی بات پر کہ ایک شخص کی دو ترمیمیں ''آؤٹ آف آرڈر'' قرار دے دی گئیں۔مسلمان نمائندوں اور مسلمان مقرروں کی تمام تجویزوں کے قتلِ عام ''ور لومڑیوں اور گیدڑوں'' کے شکار اور ناپسندیدہ ہندو سے بھی بدتر سلوک' کا شور مچایا جائے؟

وہ تمام لوگ جنہیں میری طبیعت کا حال معلوم ہے یہ بات دیکھ کر متعجب ہو نگے کہ میں نے مولانا شوکت علی کے لفظوں اور اسلوب بیان کے پیرایوں پر اسقدر وقت ضائع کیا۔یقیناً اس سے زیادہ کوئی بات میرے لئے مکروہ نہیں ہو سکتی کہ نفس مسائل کی بحث چھوڑ کر ان باتوں پر توجہ مبذول کیجائے۔اس طرح کی باتیں ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔مگر کبھی ان کے ردّ و جواب کے کوشش نہیں کی گئی۔لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ صورت حال کہاں تک اور کب تک جاری رہے گی؟ اور اگر اسی طرح جاری رہے۔تو عام مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا؟ بطور مثال کے اسی معاملہ پر غور کیا جائے۔وہ ہزار مسلمان جو قدرتی طور پر اپنے رہنماؤں کی صداؤں کے منتظر رہتے ہیں۔مولانا شوکت علی کے یہ بیانات پڑھ کر کیا خیال کریں گے؟ کیا کسی شخص کے خیال میں بھی یہ بات آ سکتی ہے۔کہ تمام شور و شغب صرف اسی لئے

کیا گیا ہے کہ دو ترمیمیں "آوٹ آف آرڈر" قرار دے دی گئی۔ جن کی وجہ سے مسلم مطالبات کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے؟ ہر شخص یہی سمجھے گا۔ کہ نہیں معلوم کتنے مسلمان مقرروں اور نمائندوں نے تقریر کرنی چاہی ہوگی۔ جنہیں جبراً روک دیا گیا۔ کتنوں ہی نے تجویزیں اور ترمیمیں پیش کی ہوں گی۔ جنہیں منظور نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ یہ معاملہ اس کثرت و شدت سے پیش آیا۔ کہ مولانا شوکت علی بے بس ہو کر اسے "قتلِ عام" کے لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اور اپنے وقتوں کو یاد کر رہے ہیں۔ جب رامپور کے تیس چالیس گرے ہاؤنڈ گیدڑوں کے پیچھے چھوڑ دیا کرتے تھے۔

نیش خارے نیست کر خونِ شہیداں نیست سرخ

آفتے بودایں شکار افگن کزیں صحرا گزشت!

ممکن ہے کوئی شخص مولانا شوکت علی کے جوشِ طبیعت سے واقف ہو اور وہ کہے کہ ان کی روایت احتیاط کے ساتھ قبول کرنی چاہیئے۔ لیکن آخر کہاں تک احتیاط کرے گا؟ بہت کرے گا۔ تو یہ کرے گا۔ کہ سیر بھر میں سے ایک چھٹانک جوشِ بیان کے نام سے نکال دے۔ چھٹانک بھر نہ سہی۔ پاؤ بھر سہی۔ لیکن اس کا تو اسے وہم و گمان بھی نہیں گزرے گا۔ کہ یہاں چھٹانک اور پاؤ بھر کا کیا سوال ہے؟ پورا رطلِ گراں ہی غائب ہے۔

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

مسئلہ نیابت:

مولوی محمد شفیع صاحب کی چوتھی ترمیم اس بارے میں تھی۔ کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت ملنی چاہیئے۔ لیکن انہوں نے پیش نہیں کی اور اس لئے اس مسئلہ پر کانفرنس میں بحث نہیں ہوئی۔ میں چاہتا ہوں۔ مختصراً اپنا خیال ظاہر کر دوں۔

مارچ ۲۶ء کی تجاویز دہلی" میں مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا۔ کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک تہائی نیابت ملنی چاہیئے۔ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی نیابت ایک چوتھائی ہوتی ہے۔ پس مطالبہ یہ تھا۔ کہ ۲۵ فی صدی کی جگہ ۳۳ فی صدی نشستیں محفوظ کر

دی جائیں۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے جو سب کمیٹی ان تجاویز پر غور کرنے کے لئے بٹھائی تھی۔اس نے بقیہ مطالب کی تائید کی۔ یہ مطالبہ چھوڑ دیا۔ بمبئی میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔تو اس نے بھی اسے اپنی تجویز میں داخل نہیں کیا۔ پھر جب مدارس کانگرس میں اس معاملہ پر بحث ہوئی تو اس وقت بھی یہ مطالبہ تجویز میں شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ یہ بات صاف کردی گئی۔ کہ چونکہ اب بنگال' پنجاب' سندھ اور سرحد کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔ اس لئے مرکز میں ان کی نیابت اس درجہ خود بخود ہو جائے گی۔ کہ چوتھائی سے زیادہ اور تہائی کے قریب ہو۔

نہرو رپورٹ نے بھی اس بات کی سفارش کی ہے۔ قاعدہ یہ قرار دیا ہے کہ آبادی کی تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کردی جائیں گی۔ اور ساتھ ہی انہیں حق ہوگا کہ عام انتخاب میں شریک ہوکر مزید نشستیں حاصل کریں جن صوبوں میں ان کی اکثریت وہ وہاں مذید نشتیں حاصل کرسکتے ہیں۔

یہ تو اس مسئلہ کی تاریخ تھی۔ اب غور کرنا چاہیئے۔ کہ جہاں تک مسلمانوں کے مقابلہ کا تعلق ہے۔ اس مطالبہ کی نوعیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں:۔

اولاً' میں قطعاً یہ بات نہیں سمجھ سکتا۔ اگر فی صدی ۲۵ کی جگہ ۳۳ نشستیں مسلمانوں کو مل گئیں۔ تو ہندو اکثریت کے مقابلہ میں انکی کیا حفاظت ہو جائیگی؟ اور ۲۵ کی جگہ ۳۳ مل جانے سے انہیں کونسی قیمتی چیز مل جاتی ہے؟ وہ مرکز میں ۲۵ فیصدی ہوں یا ۳۳ فیصدی۔ ہر حال میں غیر مؤثر اقلیت ہوگی۔ پس اصلی چیز جسکی انکے نقطۂ خیال سے ضرورت ہے وہ چند نشستوں کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ کسی ایسی قانونی حفاظت کا ہے۔ جس کے ذریعہ وقت کے خدشات دور ہوسکیں۔ لکھنؤ میں جب مسلم لیگ کی سب کمیٹی نے جلسہ کیا تھا۔ تو اس معاملہ پر دیر تک بحث ہوئی تھی۔ اور مسٹر چھاگلا نے ایک تجویز پیش کی تھی۔ جو سوئٹزرلینڈ کے کانسٹی ٹیوشن سے ماخوذ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک ایسی تجویز ہے۔ جو مرکزی حکومت میں اقلیتوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے کانفرنس نے وہ تجویز کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے حوالے کردی ہے۔ کہ

اس پر غور وفکر کرے بہرحال وہ تجویز ہو یا کوئی دوسری تجویز ضروری ہے کہ اس پر زور دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ مرکز میں دو چار نشستیں مل جائیں۔ تو یہ ہندوؤں کیلئے مفت کرم داشتن اور مسلمانوں کیلئے گناہ بے لذت سے زیادہ نہیں ہے۔

جماعتی وصف:

ثانیاً اس طرح کی تمام باتوں میں میرا نقطہ خیال دوسرا ہے۔ کاش مسلمان اسے سمجھ سکیں۔ سالہا سال کی کش مکش نے ایک بات بالکل واضح کر دی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں تک ملکی حقوق وفوائد کے معاملات کا تعلق ہے مسلمانانِ ہند کا جماعتی وصف بے طاقتی اور بے اعتمادی ہے۔ اور ہندوؤں کا جماعتی وصف تنگ دلی اور کوتاہ دستی ہے۔ وہ چیز جسے دل کا کھلا ہونا اور طبیعت کی فیاضی کہتے ہیں۔ ہمارے ہندو بھائیوں میں پیدا نہ ہوسکی اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایک ہزار برس سے ایسے حالات موجود ہیں۔ کہ پیدا ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات کو کبھی کشادہ دلی اور وسعت ظرف کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ اگر دیکھ سکتے ہیں تو کب کا یہ سارا جھگڑا ختم ہو جاتا۔ مسلمان اول دن سے بچوں کی طرح کھلونوں پر مچل رہے ہیں۔ طاقت اور تحفظ کی اصلی راہوں پر کبھی ان کی نظر نہ گئی۔ ہندوستانی وطینت کے مصالح کبھی ان کے سامنے نہ آئے۔ محض چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اپنی تمام قوت خرچ کرتے رہے۔ اور اس میں ان کے لئے کوئی بڑا فائدہ نہ تھا۔ اور ہندوؤں کی گرہ سے کچھ جاتا نہ تھا۔ اگر ہندوؤں کے اندر دانشمندی اور تھوڑی سی کشادہ دلی ہوتی' تو وہ ان کھلونوں کے ساتھ کبھی انہیں مچلنے نہ دیتے۔ وہ کہتے اگر سارا معاملہ چند نشستوں اور اسی طرح کے چند نام نہاد فوائد ہی پر آ کر رک گیا ہے۔ تو بخوشی لے لو۔ لیکن خدمت ملک میں ہمارا ساتھ دو۔

پیکاں ترا بجاں خریدار

من مرہم دیگراں نخوا ھم

لیکن تجربے نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں

کو کیا کرنا چاہیئے؟ سال ہا سال سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ مسلمانوں کے لئے دوراہوں کے سوا تیسری راہ نہیں ہے:۔

اگر مسلمان سمجھتے ہیں۔ کہ وہ اس درجہ تباہ حال اور جاں بلب ہیں۔ کہ جونہی انگریزوں کے دفتری اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ اور ان کا خاتمہ ہوا۔ تو چاہیئے صاف صاف کہہ دیں۔ کہ وہ نیابتی اور ذمہ دار طرزِ حکومت کے لئے قطعاً تیار نہیں ہیں۔ بلکہ رفارم کے نام سے جو کچھ دیا گیا ہے وہ بھی اس کے لئے موزوں نہیں۔ انہیں تو بس اس طرح کی حکومت چاہیئے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لٹریچر ''میں نان'' سسٹم سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بلاشبہ ان کا یہ فیصلہ بڑا ہی بدقسمت ہوگا۔ مگر دنیا میں قومیں اور جماعتیں اس سے بھی زیادہ بدقسمت فیصلے کر چکی ہیں۔ لیکن اگر مسلمان سمجھتے ہیں۔ کہ انہیں ملک کی سیاسی نجات کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہیئے۔ اور اس سے انکار کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ تو پھر چاہیئے۔ کہ خودداری وشرف کے احساس اور اعتمادِ نفس کی روح سے اپنے آپ کو تہی دست ثابت نہ کریں۔ اور عزم وہمت کے ساتھ یہ مرحلہ طے کریں ان کا تمام تر اعتماد صرف اپنی جدوجہد پر ہونا چاہیئے۔ نہ کہ چند زیادہ نشستوں اور نام نہاد ضمانتوں پر بلاشبہ انہیں مطالبہ کرنا چاہیئے۔ کہ ان کی جدوجہد اور ترقی کی راہ میں رکاوٹیں باقی نہ رہیں۔ اور ان مشکلوں کا بھی حل پیدا کیا جائے۔ جو ان کی تعلیمی اور اقتصادی کمزوری سے پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کو قطعاً چھوڑ دینا چاہیئے۔ جنہیں دوسری جماعت "خاص رعائیت" سے تعبیر کرسکتی ہے۔ یہ باتیں "خاص رعائیت" نہ تھیں۔ اگر دوسری جماعت میں فیاضی اور کشادہ دلی کی اسپرٹ موجود ہوتی۔ مگر جب موجود نہیں ہے۔ اور ہمارے تحفظ کے لئے یہ باتیں کوئی قیمت بھی نہیں رکھتیں۔ تو پھر یقیناً ہماری خودداری وغیرت کا تقاضا یہی ہونا چاہیئے۔ کہ اس طرح کے مطالبوں سے خود ہی دست بردار ہو جائیں اور اپنے مستقبل کا دامنِ غیرت اپنے تنگ دل بھائیوں کے منت کرم داشتن سے آلودہ نہ ہونے دیں۔

عدلِ فطرتِ ساقیست ہمت عرفی
کہ حاتم و گراں و گدائے خویشتن ست

پچھلے دنوں میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال نے پنجاب کونسل میں کہا تھا۔ کہ ہندوستان میں حکومت کے لائق نہ تو مسلمان ہیں نہ ہندو۔ یہ تو وہ جامہ ہے جو صرف انگریزوں کے ہی قامتِ موزوں پر چُست آ سکتا ہے۔

جامہ بود کہ بر قامتِ اودوختہ بود!

لوگوں نے اس بات پر بہت لے دے کی تھی۔ مگر میں کہتا ہوں۔ ان حضرات کا مذہب میرے لئے کتنا ہی ازیت وہ کیوں نہ ہو۔ لیکن میں اس کا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔ بدبختی ہی کی سہی۔ مگر ایک راہ ضرور ہے۔

کافر نتواں شد' ناچار مسلماں شو!

لیکن ان لوگوں کا مذہب قطعاً میری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جو ایک طرف نیابتی اور ذمہ دار حکومت کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس بات پر بھی اڑنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ مرکزی مجلس میں ہمیں پانچ نشستیں حق آبادی سے زیادہ مل جائیں۔ اور اگر نہ ملیں تو مسلمانوں کی حفاظت کا خاتمہ ہے۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے۔ اور اگرچہ ایک خاص گوشہ کے معاملات کیطرف اشارہ کیا ہے۔ مگر فی الحقیقت ہر گوشہ کا یہی حال ہے۔

قدم بروں از جہل' یا فلاطون شو
گرمیانہ گزیدی' سراب و تشنہ لبی ست!

مُسلمان اور کانگرس

دن کی روشنی میں آدمی کتنا ہی روشنی سے بچنا چاہے۔ روشنی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی' وہ مکان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ اب روشنی کو راہ نہ ملے گی۔ لیکن ان ہی دروازوں میں کوئی نہ کوئی دراڑ نکل آتی ہے اور روشنی کی کرنیں جھانکنے لگتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ روشنی حقیقت ہے اور حقیقت سے کتنا منہ چھپانا چاہو۔ لیکن وہ سامنے آکھڑی ہو گی۔

یہی حال آج کل مسلمانوں کا ہے۔ وہ حقیقت کی روشنی میں آنا پسند نہیں کرتے لیکن حقیقت ان کا پیچھا کب چھوڑنے والی ہے' وہ کچھ عرصہ بند دروازے میں بیٹھ کر سمجھنے لگتے ہیں۔ اب اندھیرا ہے۔ لیکن جب اس پر بھی روشنی کہیں نہ کہیں سے راہ نکال لیتی ہے تو اچانک چونک اٹھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ ایک نئی بات ظہور میں آگئی۔ حالانکہ نئی بات تو کوئی بھی نہیں ہوتی۔ ہوئی سورج اب بھی چمک رہا ہے جو صبح سے چمکنا شروع ہوا تھا۔

جب نئے دستور کے ماتحت انتخابات کا موقع آیا اور کانگریس نے فیصلہ کیا کہ انتخابات میں حصہ لے گی۔ تو یہ بات ہر واقف حال انسان نے سمجھ لی تھی کہ اس اقدام کا لازمی نتیجہ کیا نکلے گا۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں تین صوبے ایسے ہیں جہاں بحالاتِ موجودہ کانگریس اکثریت حاصل نہیں کر سکتی۔ بنگال' پنجاب اور سندھ ان صوبوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اور جب تک وہاں کے مسلمان بکثرت کانگریس میں شریک نہ ہو جائیں۔ کانگریس کے امیدواروں کی کامیابی مشتبہ ہی رہیگی یہی وجہ ہے۔ ہ جب مرکزی بورڈ کے سامنے ان صوبوں کا معاملہ پیش ہوا۔ تو میں نے اسکی مخالفت کی کہ مسلمان امیدوار کھڑے کیے جائیں۔ اور بورڈ نے یہی رائے اختیار کر لی۔ لیکن باقی صوبوں میں کانگریس

کی کامیابی قطعی تھی۔ اور صورت حال کا نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ کہ قطعی ہو۔ مگر مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے اتنی واضح بات بھی سمجھنی نہیں چاہی۔ انہوں نے طرح طرح کے غلط اندازے لگائے نتیجہ یہ نکلا۔ کہ جب انتخابات کے اعداد شائع ہوئے۔ تو صورت حال نے انہیں متحیر کر دیا۔ وہ اس طرح چونک اٹھے۔ جیسے کوئی خلاف توقع بات ظہور میں آ گئی ہو۔ انہیں اب ایک نئی بات معلوم ہوگئی۔ یہ نئی بات کہ ملک کی سیاسی بیداری اس سے زیادہ گہری اور وسیع ہے۔ جتنی انہوں نے سمجھ رکھی تھی۔ اور کانگرس ان صوبوں میں صرف اکثریت ہی نہیں لا سکتی۔ بلکہ بہت زیادہ اکثریت لا سکتی ہے یہ ان کے لئے ایک انکشاف ہوا۔ حالانکہ یہ کوئی انکشاف نہیں۔ ایک معلوم اور متوقع حقیقت کا ظہور ہے۔ یہ توقع سے زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ کئی اعتبار سے کم ہے۔

بمبئی میں کانگریس کو جتنی اکثریت مل سکتی تھی۔ بعض مقامی غلطیوں کی وجہ سے نہیں ملی۔

صوبہ سرحد کے کارکنوں کے لئے پہلا تجربہ تھا۔ اس لئے بہتر طریقہ پر کام نہ ہو سکا۔ آسام میں خالص اکثریت مل سکتی تھی۔ لیکن اس طرف توجہ نہیں کی جا سکی اگر دوبارہ انتخاب کا موقعہ آئے۔ تو یقیناً نتائج اس سے کہیں زیادہ کامیاب نکلیں گے۔ جتنے اس مرتبہ نکل چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ ان تمام لوگوں کو جو صورتِ حال میں ایک غیر متوقع انکشاف دیکھ رہے ہیں۔ صورتِ حال کے صحیح مطالعہ کی دعوت دوں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں۔ کہ ادھر چند مہینوں کی اندر ہندوستان کا آسمان و زمین بدلا جا سکتا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ گزشتہ نصف صدی کی رفتار حالات کا قدرتی نتیجہ ہے اور اس میں اہل نظر کے لئے اچھنبے کی کوئی بات نہیں۔ البتہ اگر وہ چاہیں تو ایک نئی بات ظہور میں آ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے انہیں اور کسی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اگر انہوں نے اپنی پرانی غفلت کو نئی بیداری سے بدل لیا۔ تو یقیناً ہندوستان کا آسمان و زمین بھی ان کے لئے فوراً بدل جائے گا۔ یہاں زندگی اور عمل کے ہر گوشے میں خدا کا یہی قانون کام کر رہا ہے۔ دنیا بہت پرانی ہے

اور وہ کبھی ایسا نہیں کرتی۔ کہ ہماری خاطر وہ اپنی پرانی صورت بدل دے۔ لیکن جب کبھی ہم بدل جاتے ہیں۔ تو اسے بدل جانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

انتخابات کے نتائج میں مسلمانوں نے صرف کانگریس کی کامیابی ہی نہیں دیکھ لی بلکہ ایک حقیقت بھی دیکھ لی۔ یہ ہمیشہ ان کے سامنے آتی رہتی تھی۔ مگر وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا۔ کہ کانگرس کی اس بلندی کے ساتھ ناکامی کی ایک دوسری پستی بھی موجود ہے اور وہ ان کے حصہ میں آئی ہے۔ انہوں نے کانگرس جدوجہد کا میدان صرف ہندوؤں کے لئے چھوڑ دیا۔ کانگریس کہتی رہی کہ وہ صرف ہندوؤں کے لئے نہیں ہے۔ مگر یہ کہتے رہے کہ نہیں صرف ہندوؤں کے لئے ہے نتیجہ اب ان کے سامنے ہے۔ ایک طرف سعی وعمل کی زندگی ہے۔ عشق ومقصد کا ولولہ ہے جدوجہد کا نظام ہے۔ طریق کار کی ہم آہنگی ہے۔ اور دوسری طرف کچھ بھی نہیں اور اگر کچھ ہے۔ تو معطل اور بے عمل کا سناٹا ہے۔ یا شخصی اغراض ومطامع کا ہنگامہ

گلگونہ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو

اے خون شدہ دل تو، تو کسی کام نہ آیا

وقت کے اس فوری تاثر کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو اپنے تعطل وجمود کی چبھن محسوس ہونے لگی۔ اور کانگرس کی شرکت اور عدم شرکت کا سوال از سر نو ان کے سامنے آ گیا ہے۔ مختلف سمتوں سے یہ صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ:۔

مسلمانوں کی اکثریت کانگرس سے الگ کیوں ہے؟ کیوں نہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں مسلمانوں کو اس کی دعوت دی جب وہ سیاسی جدوجہد کی پرچھائیں سے بھی دور رہنا چاہتے تھے۔

میرے فکر وعمل کی جگہ ٹھیک ٹھیک وہی ہے۔ جو ۱۹۱۲ء میں تھی۔ لیکن میں ان تمام لوگوں کو جو حال ہی کے واقعات سے متنبہ ہوئے ہیں۔ توجہ دلاؤں گا۔ کہ معاملہ کو محض کسی وقتی صورت حال سے متاثر ہو کر نہ دیکھیں۔ بلکہ اس کی اصلی اور دائمی نوعیت پر غور کریں۔

مسلمانوں کو اگر کانفرس میں شریک ہونا چاہیئے تو صرف اس لئے کہ ادائے فرض کا غیر مشروط تقاضا یہی ہے۔ اس لئے نہیں کہ کسی خاص الیکشن میں وہ بہت کامیاب ہوگئی ہے۔ اس طرح کے وقتی تاثرات پر فیصلہ و اقدام کی کوئی مضبوط عمارت نہیں اٹھائی جاسکتی۔ کانگرس سات صوبوں کے الیکشن میں کامیاب ہوئی اور آئندہ اس سے بھی زیادہ کامیاب ہوگی۔ ملک روز بروز بیدار ہورہا ہے۔ اور وہ ملک کی بیداری کی علمبردار ہے۔ لیکن مسلمانوں کو جو فیصلہ کرنا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ کہ کوئی وقتی صورتِ حالات اسے ترتیب دے سکے۔ فرض کرو یہ الیکشن والا معاملہ پیش نہ آتا۔ پھر کیا ان کے لئے ادائے فرض کے تقاضے میں کوئی کشش نہ ہوتی؟

وہ ۱۹۲۱ء میں جوق در جوق شریک ہوگئے تھے۔ بلاشبہ اس وقت ٹرکی کے معاملہ کی کشش تھی۔ تاہم کانگریس میدان میں اتر رہی تھی۔ میدان کی کوئی فتح مندی تو ابھی اسے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر آج تک کتنے ہی اتار چڑھاؤ ہوچکے۔ تاہم مسلمانوں کی ایک خاص تعداد برابر شریک رہی اور اب بھی شریک ہے۔

اس کی شرکت کے لئے کونسا واقعہ معّین کیا جائے گا؟ مسلمانوں کو تو جو فیصلہ بھی کرنا ہے۔ اور جب بھی کرنا ہے۔ صرف ادائے فرض ہی کی بنا پر کرنا ہے۔ ادائے فرض کا ایسا فیصلہ جس کی بنیاد خود اعتمادی کے یقین سے بنی ہو۔ اور جس کی سطح پر عزت و ہمت کا اعلان ہو۔ وہ کسی سے مرعوب ہوکر کیوں ادھر ادھر دیکھنے لگے؟ وہ کسی طاقت سے اندیشہ ناک ہوکر کیوں قدم اٹھانے لگے؟ ایسا فیصلہ جو خود بے اعتمادی کے یقین اور ادائے فرض کے عزم سے خالی ہو۔ فیصلہ نہیں ہوگا۔ کوئی دوسری چیز ہوگی۔ اور مسلمانوں کو جس چیز کی ضرورت ہے۔

وہ فیصلہ ہے۔ ایک فعال اور خود اعتماد دماغ کا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ وہ آج کریں یا کچھ عرصہ بعد کریں' بہر حال انہیں کرنا ہے۔ وہ ہندوستان کی موجودہ زندگی میں اس فیصلہ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ﴿كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ مسلمانوں کو متنبہ کردوں:۔

ہندوستان ماضی کی سرحد سے نکل چکا ہے۔ اور مستقبل کے دروازے پر دستک پڑ چکی ہے۔ یہ تغیر کا موسم ہے۔ تخم کا موسم ہے۔ تخم ریزی کی فصل ہے۔

خود ہم اس کی کارفرمائیاں محسوس نہیں کر رہے۔ لیکن مستقبل کا مورّخ محسوس کرے گا۔ وہ ہمارے عہد کے ایک ایک حادثہ کا سراغ لگائے گا۔ اور انہی میں نئے عہد کی ساری بنیادیں دیکھنی چاہے گا:۔

اس وقت جو نقشے بھی ہم بنائیں۔ جو چال ڈھال بھی اختیار کریں گے۔ جیسی کچھ صدائیں بھی ہماری زبانوں سے نکلیں گے۔ ان ہی سے ہماری ذہنیت کا سانچہ بنے گا۔ اور اسی سانچہ میں ہمارا مستقبل ڈھلے گا۔ پس ضروری ہے۔ کہ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کریں۔ ضروری نہیں کہ وقت کے سطحی تاثرات کی رو میں بہنے لگیں۔ ہمیں جو روش بھی اختیار کرنی ہے۔ قصد و عزم کیساتھ اختیار کرنی ہے۔ ہمیں زمین پر چلنا ہے۔ لہروں میں بہنا نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ جب مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت سے انکار کر دیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے۔ انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی۔ کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس لئے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری اور نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے۔ ہندوؤں کے لئے مفید ہوگی۔ مسلمانوں کے لئے مضر ہوگی۔

چنانچہ ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سرسید احمد خاں مرحوم کو بھی یہی راہ دکھائی تھی۔ اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا۔

مگر اب دوسرا زمانہ ہو گیا ہے۔ اب ایک طرف تو مسلمانوں کی سیاسی دورباشی کا بند ٹوٹ چکا۔ دوسری طرف کانگریس کی جدوجہد اتنی دور نکل گئی۔ کہ خود حکومت کو اپنی جگہ بدلنی پڑی۔ اور ملک کی پبلک لائف میں ان لوگوں کیلئے کوئی جگہ نہ رہی۔ جو تغیر و ترقی کے مخالف ہوں۔ نوابوں اور مہاراجوں کو یہ کہتے ہوئے اب شرم محسوس ہوتی ہے۔ کہ وہ ملک کی آزادی کے مخالف ہیں:

۱۸۹۷ء میں مرحوم سرسید نے کانگرس کے جن مطالبات کی ہنسی اڑائی تھی۔۔۔
اور اس طرح ذکر کیا تھا گویا اس سرزمین میں یہ باتیں کبھی ہونے والی نہیں۔
وہ کب کی ہو چکیں۔ اور اب ملک اصلاحات کیلئے نہیں۔ بلکہ کامل تبدیلی کے لئے لڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگرس کی عدم شرکت کے لئے ۸۷ء والی بات سودمند نہیں ہوسکتی ناگزیر ہے۔ کہ دوسری بات اختیار کی جائے۔

چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ کہ جب کانگرس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑ جاتا ہے یا خود کانگرس کا کوئی کارکن مسلمانوں کی توجہ دلاتا ہے۔ تو فوراً یہ حضرت فرقہ دارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں اور معاملہ کی صورت یہ بنا دی جاتی ہے کہ جب تک مسلمانوں کو ان کے تحفظات کی طرف سے مطمئن نہیں کر دیا جاتا۔ وہ ملکی جدوجہد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتے تو انہیں ہرگز شریک نہیں ہونا چاہیے ان حضرات نے مسلمانوں کی عدم شرکت کا جو مقدمہ ترتیب دیا ہے کہ مسلمانوں کو ملکی آزادی کی جدوجہد سے کبھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ وہ مخالف کیوں ہونے لگے۔ انہیں تو اس قافلہ کی سالاری اور اس لشکر کی سرداری پہنچتی ہے۔ وہ تو اس راہ میں نہ دوسروں سے بھی منزلوں آگے جانے کے لیے تیار ہیں مگر ساری مصیبت یہ آپڑی ہے۔ کہ انہیں اپنے حقوق کے تحفظات کی طرف سے اطمینان نہیں انہیں خطرہ ہے۔ کہ اگر برطانوی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائے گا۔ تو ہندا کثریت ان کے حقوق پامال کر دے گی۔ وہ اقلیت میں ہیں اور اقلیت سیاسی تبدیلی کا جبھی ساتھ دے سکتی ہے۔ جب کہ اسے مطمئن کر دیا جائے کہ تبدیلی کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ آج کل بھی بحث ونظر کا رخ اسی طرف پھیر دیا گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ لوگ محض حقوق اور تحفظات کا لفظ سن کے بے قابو نہ ہو جائیں بلکہ فہم وبصیرت کے ساتھ اس مقدمہ پر غور کرلیں۔

اچھا مسلمانوں کی بے اطمینانی جس نے آٹھ کروڑ انسانوں کے لیے جماعتی

خطرہ کی نوعیت پیدا کرلی۔ اور جس کی دہشت سے آزادی کا عشق اور ادائے فرض کا عزم تک دب کر رہ گیا کن کن باتوں میں ہے؟

یہ حضرات ہمیں بتاتے ہیں کہ ساری باتوں میں مسلمانوں کی کوئی بات بھی نہیں جسے وہ محفوظ سمجھ سکیں۔ انہیں ہر طرف خطرہ دکھائی دے رہا ہے وہ اپنی جس متاعِ محبوب کو دیکھتے ہیں ان کے بے بس ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے ان کے سیاسی حقوق خطرے میں ہیں۔ ان کے معاشرتی حقوق خطرے میں ہیں۔ ان کے رسوم وعقائد خطرہ میں ہیں۔ ان کی تہذیب خطر میں ہے ان رسم الخط خطرے میں ہے۔ ان کے لیے اب خطروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہا۔ پھر کاش خطروں کا سلسلہ صرف اس حد تک پہنچ کر رک جاتا مگر نہیں وہ کسی حد پر بھی رکنے والا نہیں ہمیں اس سے بھی زیاد سننے کے لے تیار رہنا چاہیے ہمیں بتلایا جاتا ہے۔ کہ مسمانوں کی بے بسی اور اندیشہ ناکی تو یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو بھی خطرے میں دیکھ رہے ہیں۔ اور انہیں اس بات کا بھی بھروسہ نہیں کہ ان کے شخصی قوانین محفوظ ہیں۔ یعنی انہیں اندیشہ ہے کہ آئندہ ایک مسلمان اپنا نکاح اس طریقہ پر کرا سکے گا یا نہیں جس طریقے سے اسلام ضوابط کی رو سے کرانا چاہیے۔ یہ حضرات مسلمانوں سے پوچھتے ہیں۔ کہ جب انہیں اپنے مذہب تک کی طرف سے اطمینان نہیں تو کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اکثریت پر بھروسہ کرکے ملکی جدوجہد میں شریک ہوجائیں۔ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾

خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جارہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بہ لحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی دوسری اکثریت اور بہ لحاظ معنوی قویٰ کے سب سے پہلی جماعت ہیں۔

اور پھر ان تمام خطروں کا انسان کیوں کر ہوسکتا ہے؟ صرف اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک ریزولیشن پاک کردے۔ جونہی اس نے ریزولیشن پاس کردیا۔ خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے معا

چھٹ جائے۔ یقین وطمانیت کا سورج چمکنے لگے گا۔ خوشحالی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اور پھر وہ خوش خوش کانگریس میں شریک ہو کر آزادی کی لڑائی لڑنے لگیں گے۔ ان کے ایک ہاتھ میں کانگریس کا پروانہ حفاظت ہو گا۔ اور دوسرے میں کانگریسی جھنڈا جب خطروں کے ہراس سے دل ڈوبنے لگے گا۔ تو کانگریس کا پروانہ شہد لگا کر چاٹنے لگیں گے جب دل کا ہراس دور ہو جائے گا۔ تو کانگرس کا جھنڈا زور زور سے ہلانے لگیں گے۔

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
اپنے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا خواہشمند نہ ہو گا کہ مسلمان کانگرس میں شریک ہوں۔ لیکن مسلمانوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ اگر وہ معاملہ کو اس صورت میں دیکھ کر قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ نہ اٹھائیں۔ اس طرح شریک ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ کہ شرکت کا نام بھی ان کی زبان پر نہ آئے اگر کانگرس میں شریک ہونا چاہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے۔ یا دوسرے انہیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کی بے بسی اور بے چارگی اور اس حد تک پہنچ چکی ہے۔ کہ وہ سمجھتے ہیں خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے۔ اور تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگرس کے اطمینان دلانے پر' اور خود ان کے اندر خود اعتمادی وہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی۔ جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے تو میں کہوں گا۔ کہ ایسی زندہ نعشوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں۔ وہ نہ تو انگریزی اقتدار کی طرف دیکھیں نہ کانگرس کی طرف وہ خودداری کے ساتھ مستقبل کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ یہ ان کی چودہ صدیوں کی تاریخ کا کم سے کم مطالبہ ہے۔ جس سے ان کے کانوں کو بہرا نہیں ہونا چاہیے۔

واذلم یکن من الموت بد
ممن الکارن تکون جبانا

بلا شبہ میں آرزومند ہوں کہ مسلمان میدان میں اتریں لیکن میں چاہتا ہوں کہ انہیں اس طرح میدان میں دیکھوں جس طرح ایک بہادر اور بے خوف آدمی میدان کا رخ کرتا ہے۔ خود اعتمادی سے سر اٹھا ہو عزم ویقین سے سینہ تنا ہو وہ میدان کے خطروں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ یہ خطرے ہر طرف سے آسکتے ہیں۔ مگر وہ جانتا ہے کہ خطروں کے لیے اسے دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا ہے۔ خود اپنی ہمت اور پامردی پر اعتماد کرنا ہے۔ لیکن اگر وہ اس طرح میدان میں نہیں اتر سکتے اور ساتھیوں سے شرطیں منوا لینے کی فکر میں ہیں۔ تو میں بلا تامل اپنی ساری آرزوؤں سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ میں یہ برداشت کرلوں گا کہ وہ میدان میں نہ اُتریں مگر اسے برداشت نہیں کرسکتا کہ ڈرتے ہوئے سہمے ہوئے قدم اٹھائیں اس طرح کہ ڈرتی ہوئی روح اور کھوئی ہوئی ہمت لے کر اگر وہ میدان میں اترے بھی تو یہ زندگی اور عزت کا اقدام نہ ہوگا۔ بیچارگی اور نامرادی سے کسی کے پیچھے گھسٹنا ہوگا۔ انہوں نے جونہی معاملہ کو اس شکل میں دیکھا کہ وہ خطروں میں گھر گئے ہیں۔ اور تحفظ کی شرطیں منوا کر ہی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ تو پھر ان کی ہستی باقی نہیں رہی انہوں نے زندگی اور کامرانی کی جگہ کھو دی انہوں نے نامرادانہ مان لیا کہ وہ دوسروں کے رحم پر ہیں۔ اور یہی مان لینا ان کے لیے سُم قاتل ہے وہ کانگرس میں شریک نہیں ہونا چاہتے' نہ ہوں مگر خدا کے لیے یہ زہر کا پیالہ لبوں سے نہ لگائیں۔ یہ ان کے حلق سے نیچے اترا اور ان کے دل کا ایک ایک ریشہ مردہ ہوگیا۔ دو حالتیں ہیں اور اس لیے حکم بھی دو ہونے چاہئیں۔ ایک بے عملی کا تعطل ہے ایک خود فراموشی کی موت ہے۔ اگر مسلمان کانگرس میں شریک ہوئے تو یہ خود فراموشی کی موت ہوئی تعطل آج نہیں کل دور ہو جائے گا لیکن اگر موت آئی تو اس کون ٹال سکے گا؟ افسوس ان نادانوں کی سمجھ پر یہ شاخوں اور پتوں کے لیے روتے ہیں۔ اور ان کے حصول کا طریقہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ جڑ پر آرا چلاتے رہیں۔ حالانکہ نہیں جانتے شاخوں اور پتوں کا سارا کارخانہ جڑ کے دم سے قائم رہتا ہے جب جڑ ہی نہ رہی تو شاخیں کہاں سے آئیں گی؟ پھول پتے کس میں لگیں گے؟ یہ کہاں کی باغبانی ہے کہ پتوں کے عشق میں سرے سے جڑ ہی کا خاتمہ

کر دیا جائے آہ! میر درد کا شعر کتنا پامال ہو چکا ہے پھر بھی اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

یہ کیا موت کے گھونٹ ہیں۔ جو اعلانیہ مسلمانوں کو پلائے جا رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں جو ان کے ہاتھ پکڑے۔ آخر بزدلی اور ہمت فروشی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے آٹھ کروڑ انسانوں کو جن کی شکن آلود پیشانیوں پر آج بھی چودہ صدیوں کی تاریخ کے مدہم حروف پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ یقین دلاتا کہ وہ مر گئے تباہ ہو گئے اور اس قابل بھی نہ رہے کہ مستقبل میں اپنے مفاد کی حفاظت کر سکیں۔ یقیناً ان کی خودداری اور خود اعتمادی کے سارے احساسات کو یک قلم قتل کر ڈالنا ہے۔ اور اگر ایک جماعت ان احساسات کی روح سے محروم ہو گئی ہے۔ تو پھر حقوق کے پروانے اور تحفظات کے چشمے اسے کیا کام دیں گے۔ افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی بھی روح سے ہوتی ہے روح اگر موجود ہے تو سب کچھ ہے روح اگر نکل گئی تو سب کچھ جاتا رہا جسم جماعت کے لیے یہ روح کیا ہے؟ جماعتی شرف و عزت کا احساس خود اعتمادی کا یقین عزت و ہمت کا ولولہ' سعی و عمل پر اعتماد جس جماعت میں یہ روح موجود ہے وہ زندہ ہے تو زندگی کے تمام لوازم حاصل کر کے ہی رہے گی۔ جس جماعت نے یہ روح کھو دی ہو مردہ ہو گئی اور مردے کے چاروں طرف قیمتی غذاؤں کے کتنے ہی خزانے جمع کر دو۔ وہ زندہ نہیں ہو جائے گا۔

ڈاکٹر امبیدکار نے اچھوتوں کی جنس کی نخر سے ہندوستان کے پاس رکھ دی۔ جو زیادہ بولی بول سکے' آگے بڑھے۔ اور خریدے۔ کیا مسلمان چاہتے ہیں:۔

> وہ بھی سیاست کی ایک ایسی ہی جنس بن کر رہ جائیں جو ہمارے جی کا ڈر نکال دے ہمیں خریدے؟ اسی بازار میں انہوں نے کبھی قوموں کی قسمتیں خریدی تھیں اگر آج اس قابل نہیں رہے کہ دوسروں کی متاع ہمت خرید سکیں۔ تو کم از کم خود اپنی ہمت تو اس ارزانی کے ساتھ فروخت کرتے نہ پھریں۔

ایک تاریخی خُطبہ
رام گڑھ آل انڈیا نیشنل کانگریس کا

(۵۳واں سالانہ اجلاس)

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے قوموں کی جدو جہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب ہر وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا اور ضروری تھا کہ ہم مختلف منزلوں سے گزرتے ہم ہر منزل میں ٹھہرے۔ مگر کے کہیں نہیں ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا مگر ہمارا دل اٹکا نہیں بھی نہیں ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں۔ مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور کاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں۔ لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کوتاہی نہیں کی اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن آج نظر اٹھایئے۔ اور سامنے کی طرف دیکھئے۔ نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف کھائی دے رہا ہے۔ بلکہ خود منزل بھی دور نہیں

ہے۔البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور اور آخر منزل سے نزدیک کردیا ہے وہاں طرح طرح کی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کردی ہیں۔اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش ان کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بالکل نزدیک کردے۔اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں الجھا دے ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے بھروسہ کا اظہار کیا ہے ہو یقیناً بڑے سے بڑا بھروسہ ہے جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کرسکتے تھے۔یہ بہت بڑی عزت ہے۔اس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے میں اس عزت کے لیے شکرگزار ہوں اور ذمہ داری کے لیے آپ کر رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں مجھے یقین ہے کہ جس گرم جوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ویسی ہی گرم جوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا سوال:۔ اب میں سمجھتا ہوں۔مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آنا چاہیے۔

ہمارے لیے وقت کا سب سے پہلا اور اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلان جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے۔وہ کس طرف جارہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگرس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا۔کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنو میں یورپ کی بین الاقوامی (انٹرنیشنل) صورت حال پر ایک تجویز منظور کرکے اس نے اپنے نقطۂ خیال سے صاف صاف اعلان کردیا۔اور اس کے بعد وہ کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔یہ گویا اس بارمیں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا۔

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بتاتے ہوئے ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانہ کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا ہے اور فکر و عمل کی لہریں ایک گوشے میں ابھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے یہی احساس تھا جس نے اس فیصلہ کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نانسی ازم کی جوارتجاعی (Reactimary) (ری ایکشنری) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں ہندوستان انہیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے عالم گیر خطرہ تصور کرتا ہے۔ اور اس کا دل و دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نانسی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا تو ہمارے لیے ناممکن تھا۔ کہ ہم اس پرانے خطرے کو بھلا دیتے جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیاد قوموں کے امن و آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان ارتجاعی قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے۔ یہ خود ہمارے گھر

پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات کھول دی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندوستان جو اپنے ازادارادے اور آزاد پسند سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی حصہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے جب کہ اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نا تسی ازم اور فیشی ازم سے بیزار ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے۔ تو اس کے صاف معنی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیت کے ساتھ زندہ موجود ہے۔ اور ہندوستان کسی حالت میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لیے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگرس کے اجلاس لکھنو سے لے کر اگست ۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔

کانگرس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔ اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہوئی۔

اب میں اس واقعہ پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا اور درخواست کروں گا۔ کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھئے پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے۔ برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصہ کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا اور اس پر آمادہ ہوگئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں اور یہ بات خود برطانوی حکومت

کے حق میں تھی۔ کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے قائم رکھے ساتھ ہی صورتِ حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق سے ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں۔ اور صورت حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی۔ کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلو میسی (Diplomacy) کی خاطر وہ اس کی ضرورت محسوس کرے گی۔ کہ اس کو موقع پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے۔ کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب وہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا ہے تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے اس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا۔ اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجہ تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع نہ دیا گیا ہو۔ لڑائی میں اس کے شامل ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیدیا جائے جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش ایمپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقع دیا گیا۔ کینڈا، اسٹریلیا' نیوزی لینڈ' جنوبی افریقہ' آئر لینڈ سب کے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آئر لینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور اس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کے تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ولیرا نے برطانیہ کے ہمسائے میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک السٹر ______ کا سوال قابل اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا۔ وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے

انکار کرتا ہے لیکن برطانوی نوآبادیوں کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جن ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں کا درجہ ملنے والا ہے ______ اس کی ہستی کا کیونکہ اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اسے دنیا کی تاریخ میں شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا بغیر اس کے کہ اسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اس کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ لیں مگر نہیں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم اسے اور زیادہ نزدیک سے اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے!

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سلگی تھی اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یادش بخیر پریذیڈنٹ وِلسن کے چودہ نکتے دنیا کے سامنے آئے اور ان کا جو کچھ حشر ہوا دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورت حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنے فتح مندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ کہ ایک نیا ردِ عمل شروع ہو جائے وہ شروع ہوا اس نے اٹلی میں فیشسزم اور جرمنی میں نانسزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت دنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی دوسرا رتجاعی قوتوں کے آگے بڑھانے والی اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لیے فیشٹ اٹلی اور نانسی جرمنی سے کہیں زیادہ سودیت روس کی ہستی ناقابل برداشت تھی اور جو اسے برطانوی سامراج کے لیے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی۔ تین برس تک

اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے اپنے طرز عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نازسی قوتوں کی جراتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابن سینا۔ اسپین۔ آسٹریلیا۔ چیکوسلاواکیہ اور البانیہ کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انہیں دفن کرنے میں برابر مدد دی لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں اُبھر آیا اور نازسی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا۔ تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اُسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا کیوں کہ اگر اب نہ اترتی تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے نہ قابل برداشت ہوجاتی۔ اب چھوٹی قوتوں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ جمہورت آزادی اور عالم گیر امن کے نئے نعروں نے لے لی۔ اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ ۳ ستمبر کا اعلانِ جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالم گیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہورہی تھیں۔ ان خوشنما صداؤں پر کان لگادیئے۔

کانگریس کا مطالبہ:

۳ ستمبر ۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۷ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی داروھا میں اکٹھی ہوئی۔ تا کہ صورت حال پر غور کرے ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگریس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے۔ جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلانِ جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا۔ وہ بھی اس کے نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کردیتی جو صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل ودماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضا کررہے تھے۔ اپنے کانوں کو بند کرلیا اس نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کرکے وہ قدم اٹھایا۔ جیسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ اس صورت حال میں اس کے لیے وہی

ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیئے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ی لڑائی کیوں لڑی جارہی ہے اس کا مقصد کیا ہے اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المنا کی کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔ جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے۔ اور یہ واقعی اس لیے لڑی جارہی ہے کہ آزادی جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم سے دنیا کو آشنا کی جائے تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبہ کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے کہ خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں اُمید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا تو مجھے یقین ہے۔ کہ میں آنے والے مورخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کر رہا ہوں یہ سچائی اور معقولیت کا ایک سادہ مگر نا قابلِ رونوشتہ ہے جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالم گیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ چکی ہیں مبتلا کی گئی اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی تا کہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے کمزور قوموں کی آزادی۔ امن کی ضمانت خود اختیاری فیصلہ ہتھیاروں کی حد بندی بین الاقوامی پنچائیت کا قیام یہ اور اس طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں لگائی گئیں مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی ہر جلوہ خواب و خیال خیال ثابت ہوا آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولنا کیوں میں دھکیلا جارہا ہے۔ کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں

اس درجہ مایوس ہونا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

کانگریس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانے سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلہ کے لیے پہلی کڑ وائسرائے ہند کا دہ اعلان بہم پہنچاتا ہے۔ جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شائد حکومت ہند کے سرکاری علم ادب کے الجھے ہوئے انداز اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیاد مکمل نمونہ ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھا جانے کے بعد بھی اس قدر بتانے پر بمشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیراعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی رشتوں کی درستی کا ذکر کرتی ہے "جمہوریت" اور قوموں کی آزادی کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ جہاں تک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کہ وائسرائے کا اعلان شائع ہوا۔ اور ۲۲ اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی۔ کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کر سکتا۔ اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیے جو اس وقت تک اس لیے ملتوی کر رکھا تھا جو فیصلہ کمیٹی نے کیا وہ اس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے۔

> ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کر لے کمیٹی کانگریس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے۔ کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں۔

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزاروں نے استعفے دیدیا۔ یہ تو اس سلسلہ کی ابتداء تھی اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کر کے کہاں تک پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونک جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔ جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی۔ اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انہوں نے ۶ فروری کو شائع کیا۔ اس کی آخر کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے۔ کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستوا اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لیے خود اختیاری فیصلے کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا؟ پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہتی ہیں وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اُٹھایا۔ حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ لڑائی کا مقصد ہے مگر اس کا دائرہ یوروپ کی جغرافیائی حدودں سے باہر نہیں جاسکتا۔ ایشاء اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرات نہیں کرنی چاہیے۔ کہ امید کی نگاہ اُٹھائیں مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کردی اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انہوں نے ہمارے لئے برطانوی حکومت کے صاف طرز عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں۔

"ہماری لڑائی اس لئے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت

حاصل کرلیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ اپنی آزادی کو بے جا
زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔"

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانوی زبان سے نکلا ہے مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانوی نہیں ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اس عام ذہنیت کی ترجمانی کررہا ہے جو تقریباً دوصدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انسان کے انفرادی واجتماعی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے۔ ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لئے خاص سمجھا گیا۔ اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جاسکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں۔ اور ہمیں ان نشانیوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنہیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک انسان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ آرہا تھا وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کردیا ہے ہم نے جب اعلان جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا کیا مقصد ہے اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو اس بات سے ہم بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی سترھویں صدی اور انیسویں صدی میں کیا رہ چکی ہے ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ۱۹۳۹ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی وہ اب بھی سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکی ہے ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہش مند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو نوآبادیات کا درجہ

حاصل کرے ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ وہ اس کی بہت زیادہ خواہش مند ہے مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لیے صورت حال بالکل واضح ہوگئی ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اس طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہے ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جاری ہے۔

اب ہم اس جگہ پر واپس آ جائیں جہاں سے ہم چلے تھے ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا۔ کہ ۳ ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم اٹھا چکے ہیں۔ اس کا رخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کو جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف ابھر آیا ہوگا کہ اب اسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں۔ میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں ہم نے عارضی تعاون کا جو قدم ۳۷ء میں اٹھایا تھا۔ ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رخ ترک تعاون کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔ کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اٹھا دیا جائے تو وہ رک نہیں سکتا۔ اگر رکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔

ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں مجھے یہ یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں میں آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آتا ہے تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کو کش مکش میں ایک طاقت جب ہی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے۔ جبکہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرز عمل بدلتے رہے ہیں۔ مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خودغرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسیوں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں۔ یورپ کی نئی ارتجاعی قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہہ و بالا کر دیے اور انصاف اور معقولیت کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ اُبھار رہی ہے۔ وہاں امید کا ایک دوسرا رخ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالم گیر بیداری بھی ہے جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف ابھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظام کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے۔ اور معقولیت انصاف اور امن کے ایک نئے نظام کے لیے بیقرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر ابھر رہی ہے۔ اور ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنہیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا۔ آئندہ کے لیے معقولیت انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح اُمیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جائیں معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے

لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی اگر آج برطانوی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے؟ مہاتما جی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جوان پر کھولا جاتا ہے بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں۔ بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ برطانوی کابینہ کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن وانصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعوؤں کے لیے ایک حقیقی کسوٹی تھی دعوے کسوٹی پر کیے گئے اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے۔ معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گزشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگرس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا تو اس وقت ہم سے کسی شخص کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی۔ کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا فرقہ دارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جا سکے گا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں۔ جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے ہندوستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی۔ کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے مخالفت کرنے کی جرات کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے

طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں۔ وقت کی عام آب وہوا کے تقاضے سے بے بس ہو رہی ہیں اور انہیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورت حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیئے وہاں اس گوشہ کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ' دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کے فرقہ دارانہ مسئلہ کے ساتھ غلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے مسئلہ ہے کہ حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ خارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرز عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندورنی اختلافات کو ابھار کر نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ اور ہمارے لیے اب بے سود ہے۔ کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہش مند نہیں ہوسکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لے سب سے بڑی ضمانت ہے لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی۔ اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اس گوشے میں وہ اپنے طرز عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوششیں کریں گے لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا اور ابھی دور کی نسبت کو یقین دلایا جارہا ہے۔ کہ ختم ہو گیا اسے بھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہر حال اب آپ خواہ کچھ بھی کہہ رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندورنی مسائل رکھتا ہے۔ اور ان مسئلوں میں ایک

اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی یہ مسئلہ موجود ہے۔ اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ ہو کر اٹھے گا۔ یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسائل کی موجودگی پر اعتراضات کے معنی صرف یہی ہونے چاہئیں۔ کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ اسے ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اس غرض سے کام میں لاتی رہی اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے۔ تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرت طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اوّل دن سے دعویٰ رہا ہے۔ کہ وہ ہندوستان کو بحیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے ہندوستانی قوم کے لیے اُٹھانا چاہتی ہے ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگریس نے یہ دعویٰ کر کے دنیا کو اس بات کا حق دیدیا ہے۔ کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اس کی طرزِ عمل کا جائزہ لے میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگرس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے۔ اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی اس کی اہمیت اس کے فیصلہ کا طریقہ کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے اس کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی اس نے اس کے فیصلہ کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا۔ جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارہ میں کوئی نہیں بتلایا جاسکتا۔ اگر بتلایا جاسکتا ہے تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور

آج بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط پر یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک نا قابل انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارہ میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا۔

(۱) ہندوستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

(۲) اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں۔ نہ کہ اکثریتیں۔ اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضا مندی سے ہونا چاہیے نہ کہ کثرت رائے سے اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرز عمل میں کوئی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگری اپنے اداءِ فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں اس تمام عرصہ میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقے سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا۔ اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرزِ عمل بھی تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر

بار باراس طرز عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں۔ مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ اس کے لیے ناکافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی راؤں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی۔ خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرزِ عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے۔ جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے۔ کہ اقلتیوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ کو روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آ رہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقعہ نہیں دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر لیں۔

ہم میں تفرقے پیدا کئے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقعہ نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے

چاہئیں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں۔ کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

مسلمان اور ہندوستان:

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں۔ جو آج سے ۲۸ برس پہلے میں ''الہلال'' کے صفحوں میں لکھتا رہا ہوں اگر چند اشخاص ابھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا اپنا حافظہ تیز کر لیں میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا۔ اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

> ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے۔ جتنی یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلط نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمان پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں

نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گزشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکہ ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیدار کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئیں تھیں ایک یہ کہ:۔

> ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے اس لیے متحد قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری یہ کہ:۔

> مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہ جاؤں گا میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ کو معلوم کرنی ہی ہے تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی (اب یونائیٹڈ آونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے۔ اور گو پچاس برس گزر چکے مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی ''اقلیت'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ

نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو۔ لازمی طور پر ''اقلیت'' ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑا اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے فرض کیجیے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں ایک کی تعداد ایک کڑوڑ ہے دوسری کی دو کروڑ ہے اب اگر چہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا۔ اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا۔ مگر سیاسی نقطہ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک قلیت فرض کر کے اس کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کی نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factor) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت ''اقلیت'' کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی

اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ ایک آزاد جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی۔

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم بھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی ''اکثریت'' اور ''اقلیت'' کا تصور کرتے رہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک ''اقلیت'' کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انہیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انہیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔

ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (Constiuion) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے کل حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف ہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات دفاع (Defence) کسٹم وغیرہ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دفاع جو ایک جہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لا سکتا ہے۔ اور اندیشوں کے قبول کرنے کے لے تیار ہو جاؤ جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے

آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے ہم ابھی تک دریا کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں۔ مگر دریا میں اترتے نہیں ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے ہمیں دریا میں بے خوف وخطر کودنا چاہیے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کی ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

ایک بنیادی سوال:

تقریباً ۳۰ برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدو جہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی۔ اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی وجہ سے اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ عام آب وہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی میں بہت جلد ایک آخر نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کر لیں یہ فیصلہ ہم کیوں کر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب میں موقوف ہے ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان نہیں آئندہ کا کوئی وعدہ دستور اساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہوتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور ہمیں بھی یہی خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔

لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے پھر ہمارا راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک مذبذب' بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی' یقین' عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا وقت کا کوئی الجھاؤ حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ' معاملوں کی چبھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے ہوئے جائیں۔

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا میرے لیے ممکن تھا۔ کہ اس کا تصور بھی کر سکوں میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال پھینکی ہو۔ یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے آپ کو پہلی حات میں دیکھنا برداشت کرے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانان ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اور آواخر میں جب چار برس کی نظر بندی کے بعد رہا ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے اور واقعہ کو بیس برس گزر چکے اس عرصہ میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے حالات کے نئے سیلاب بہے خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں لیکن آگے بڑھنے کی راہ اس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی

کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاتا ہوں گا میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ ان میں کوئی ایسی حالت نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی حالات صرف میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائز لیا۔ میں مجبور ہوں اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے لیے ممکن ہمیں اپنے یقین سے لڑوں میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہ عمل ہوسکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی تھی۔

> میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا۔ مگر آج مجھ سے اختلاف ہے۔ میں انہیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا۔ مگر میں ان سے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جاسکتیں میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے مگر انہیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کرلیں وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روائتیں میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے

چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ اسلام کے علوم وفنون اسلام کی تہذیب میرے دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ ہیں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Faetor) ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی ہے ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیرانِ اسلام کا بھی تھا یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کی دھاروں کا ملان تھا یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگھم میں مل جانا پڑا ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم

پر کھول دیئے ہم نے اسلام کے ذخیرہ کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دیدی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سر زمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے۔ تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرہ کو اس سے زیادہ اور وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ آج وہ سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگانِ ہند ایک مذہب مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترکہ (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا۔ ہماری زبانیں ہماری شاعری ہمارا ادب' ہمار معاشرت' ہمارا ذوق' ہمارا لباس ہمارے رسم ورواج ہمار روزانہ زندگی کی بے شار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو ہمارے بولیاں الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر دیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے۔ اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہمارا یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ میں جو چاہتے ہیں کہ ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں۔ تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں۔ جو وہ

ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے۔ تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیوں کہ یہ اک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید مذہب میں ضرورت ہے مگر منافرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہم پسند کریں یا نہ کریں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضا مند ہونا چاہیے۔ اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں مجھے ایک بات کی یاد دلانے کی اجازت دیجئے۔ کہ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دردمدار تین چیزوں پر ہے۔

> اتحاد، ڈسپلن، اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی وسعت دے دی ہے کوشش کیجیے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

مسئلہِ زکوٰۃ

دنیا میں کوئی دین نہیں جس نے محتاجوں کی اعانت اور ابناء جنس کی خدمت کی تلقین نہ کی ہو۔ اور اسے عبادت یا عبادت کا لازمی جزو نہ قرار دیا ہو۔ لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ وہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر مستطیع مسلمان پر ایک خاص ٹیکس مقرر کر دیا جو اسے اپنی تمام آمدنی کا حساب کر کے سال بہ سال ادا کرنا چاہیے۔ اور پھر اسے اس درجہ اہمیت دی کہ اعمال میں نماز کے بعد اسی کا درجہ ہوا۔ اور قرآن کے ہر جگہ دونوں عملوں کا ایک ساتھ ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی کہ کسی جماعت کی زندگی کی سب سے پہلی شناخت یہی دو عمل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے کہا:۔

﴿وَاللّٰهِ لَاُقْتُلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ﴾ (متفق علیہ)

بلاشبہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مواعظ اس بارے میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کہا کہ اتنا دے دو' بلکہ کہا سب کچھ دے دو لیکن چونکہ اسلام کی طرح کوئی معین نظم قائم نہیں کیا۔ اس لیے یہ تعلیم محض زہد و ترک دنیا کا ایک اعلیٰ مقام بن کر رہ گئی۔ اور مسیحیت کے صدر اول کے سوا (جب کہ کلیسا کی بنیاد باہم اخوت واشتراک پر قائم کی گئی تھی) کوئی زمانہ ایسا ظہور میں نہ آسکا کہ عیسائیوں میں اس تعلیم کے نتائج نے نشوونما پایا ہو۔

پھر اس باب میں ایک دوسری خصوصیت بھی ہے یعنی وہ علت جو نہ صرف زکوٰۃ کے لیے بلکہ تمام صدقات وخیرات کے لیے قرار دی گئی اور جس کی وجہ سے اس معاملہ نے بالکل ایک دسری نوعیت اختیار کر لی ﴿لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (۵۹:۷)

تا کہ رسانہ ہو مال و دولت صرف دولتمندوں کے گروہ ہی میں محصور ہو کر رہ جائے۔

یعنی زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ دولت سب میں پھیلے سب میں بٹے کسی ایک گروہ ہی کی ٹھیکیداری نہ ہوجائے اور اسی صورت کی آیت (۳۴) میں گزر چکا ہے ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ جو لوگ چاندی سونا خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کے لیے اگر کوئی بشارت ہوسکتی ہے تو یہی کہ عذابِ دردناک کی بشارت دے دو اور حدیث بعث معاذ الی الیمن زکوٰۃ کا مقصد یہ فرمایا کہ:۔

(دولت) ان کے دولتمندوں سے وصولی کی جائے۔ اور پھر ان کے محتاج افراد میں لوٹائی جائے۔(رواۃ الجماعۃ)

ان تصدیقات سے معلوم ہوا کہ قرآن کی روح دولت کے احتکار و اختصاص کے خلاف ہے یعنی وہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک گروہ کی ٹھیکیداری میں آجائے یا سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہوجائے جو دولت کو خزانہ بنا کر جمع کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ دولت ہمیشہ سیر دگردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ تمام افراد قوم میں پھیلے اور منقسم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ورثہ کے لیے تقسیم و اسہام کا قانون نافذ کر دیا اور اقوام عالم کے عام قوانین کی طرح یہ نہیں کہا کہ خاندان کے ایک ہی فرد کے قبضہ میں رہے۔ جونہی اک شخص کی آنکھیں بند ہوئیں اس کی دولت جو اس وقت تک تنہا ایک جگہ میں تھی اب وارثوں میں بٹ کر کئی جگہ سے پھیل جائے گی۔ اور پھر ان میں سے ہر وارث کے وارث ہوں گے اور اسے بانٹتے اور پھیلاتے رہیں گے۔

اور پھر یہ وہ ہے کہ اس نے سود کا لین دین حرام کر دیا اور قاعدہ یہ ٹھہرایا کہ ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۲:۲۷۶) اللہ سود کا جذبہ گھٹانا چاہتا ہے۔

یعنی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ جس قوم میں سود کا جذبہ اُبھرے گا اس کے غالب افراد شقاوت و محرومی میں مبتلا رہیں گے۔ جس قوم میں خیرات کا جذبہ اُبھرے گا اس کا کوئی فرد محتاج و مفلس نہیں رہے گا۔

اور اسی لیے اس نے سود کے معاملہ کو اتنی اہمیت دی کہ فرمایا' جو لوگ اس پر مصر رہیں گے' وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کریں گے ﴿فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (۲:۲۷۰) کیونکہ اس معاملہ پر جماعت کی بنیادی فلاح موقوف تھی۔ اور ضروری تھا کہ اسے ایمان وانقیاد کا معیار قرار دیا جاتا۔

اور یہ وہی ہے کہ سورۂ بقرہ میں انفاق کا حکم دینے کے بعد متصلاً فرمایا:۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُو الْاَلْبَابِ﴾ (۲:۲۶۹)

یعنی یہ بات کہ اتنی کمائی کا حصہ دوسرے افراد جماعت کو دینا کھونا نہیں ہے پانا ہے بہت دقیق بات ہے اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو صاحبِ حکمت ہیں۔ اور جس کسی نے حکمت کی دولت پائی تو اس نے بڑی بھلائی پالی ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُو الْاَلْبَابِ﴾

قرآن وسنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعہ کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اذعان ہوگیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشہ میں دولت اور وسائل دولت کے احتکار و اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے' ''احتکار'' یہ کہ دولت کا کسی ایک طبقہ ہی میں محصور ہوجانا ''اکتناز'' یہ کہ دولت کے بڑے بڑے خزانوں کا افراد کے پاس جمع ہوجانا۔

> اس کے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہوجائے اور صرف چند خانے ہی ہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہوجائے گا۔ جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں گے' نہ مفلس و محتاج طبقے ایک طرح کی

درمیانی حالت غالب افراد پر طارہ ہو جائے گی بلا شبہ زیادہ سے زیادہ
کھانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی
مومن زندہ نہیں رہ سکتا۔لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ
انفاق پر مجبور بھی ہوگا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی
اتنی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوشحال ہوتی جائے گی۔
قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے ہی
لیے نہیں کمائیں گے تمام افراد قوم کے لیے کمائیں گے یہ صورت پیدا
نہ ہو سکے گی ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا
پیام ہو جائے جیسا کہ عام طور پر ہو رہا ہے۔

یہ بات کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کس طرح کی مدنیت اور اجتماعیت پیدا ہو سکتی ہے؟ جس طرح اہم ہے اتنی ہی زیادہ دقیق بھی ہے البیان میں بہ ضمن تفسیر بقرہ اس کی مفصل بحث و تحقیق ملے گی۔

اگر مسلمان آج اور کچھ نہ کریں' صرف زکوٰۃ کا معاملہ ہی احکام قرآن کے مطابق درست کر لیں تو بغیر کسی حل کے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام مشکلات و مصائب کا حل خود بخود پیدا ہو جائے گا۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ یا تو مسلمانوں نے احکام قرآنی کی تعمیل یک قلم ترک کر دی ہے یا پھر عمل بھی کر رہے ہیں تو اس طرح کہ فی الحقیقت عمل نہیں کر رہے ہیں۔ قرآن نے زکوٰۃ کا معاملہ ایک خاص نظام سے وابستہ کر دیا ہے اور اسی نظام کے قیام پر اس کے تمام مقاصد و مصالح کا حصول موقوف ہے۔زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے بالکل اسی طرح کا ٹیکس جس طرح آج کل انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے پس اس کی ادائیگی کا طریقہ یہ نہ تھا کہ ہر شخص خود ہی اپنا ٹیکس نکالے اور خود ہی خرچ بھی کر ڈالے' بلکہ یہ تھا کہ حکومت اپنے کلکٹروں کے ذریعہ ہر شخص سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرے اور پھر ضروریات وقت کے

مطابق جس مصرف کو مقدم دیکھے اس میں خرچ کرے جب حکومت کے مقررہ عامل کو اپنی زکوٰۃ دیدی اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ چنانچہ اسی لیے لکڑوں اور عاملوں کی تنخواہ کا بار بھی اسی فنڈ پر ڈال دیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا و العاملین علیها جو کارندے وصولی کے لیے مقرر ہوں ان کے ضروری مصارف کا بار بھی اسی فنڈ پر ہے۔ اگر ادائیگی کے لیے یہ بات ضروری نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی حد میں مستقلاً عمال حکومت کا ذکر کیا جاتا۔

اور پھر یہ وجہ ہے کہ صاف و صریح لفظوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اس باب میں عمال حکومت کی اطاعت کریں اور بلا عذر زکوٰۃ ان کے حوالہ کردیں حتیٰ کہ اگر عمال ظالم ہوں یا بیت المال کا روپیہ ٹھیک طور پر خرچ نہ ہو رہا ہو۔ جب بھی اصلاح حال کی سعی کے ساتھ ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ بطور خود خرچ کر ڈالی جائے بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا:۔

﴿ اِنَّ قَوْمًا مِّنْ اَصْحَابِ الصَّدَقَةِ يَعْتَدُوْنَ عَلَيْنَا ﴾ عمال کا ایک گروہ صدقہ لینے میں ہم پر زیادتیاں کرتا ہے کیا اس کا مقابلہ کریں؟ فرمایا نہیں (ابوداؤد) سعد بن وقاص کی روایت میں صاف موجود ہے ﴿ اِدْفَعُوْا اِلَيْهِمْ مَا صَلُّوْا ﴾ جب تک وہ نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ انہیں دیتے رہو۔

بنو امیہ کے زمانہ میں جب نظامِ خلافت بدل گیا۔ اور حکام ظلم و تشدد پر اتر آئے تو بعض لوگوں کو خیال ہوا ایسے لوگ ہماری زکوٰۃ کے کیوں امین سمجھے جائیں؟ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہی کو دینی چاہیے یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود اپنے ہاتھ خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک شخص نے پوچھا اب زکوٰۃ کسے دیں؟ کہا وقت کے حاکموں کو اس نے کہا۔

﴿ اِذْ يَتَخَرَّوْنَ بِهَا ثِيَابًا طَيِّبًا ﴾ وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں پر خرچ کر ڈالتے ہیں فرمایا ''وَاِنْ'' اگر چہ ایسا کرتے ہیں مگر دو انہی کو (ابن ابی شیبہ) کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں رہ سکتا۔

صدرِ اوّل سے لے کر آخر عہد عباسیہ تک یہ نظام بلا استثناء قائم رہا لیکن ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کا سیلاب تمام اسلامی ممالک میں امنڈ آیا اور نظامِ خلافت معدوم ہوگیا تو سوال پیدا ہوا اب کیا کرنا چاہیے؟ فقہا حنفیہ کے جس قدر شروح ومتون اور کتب فتاویٰ آج کل متداول میں زیادہ تر اسی دور میں یا اس کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اور اس وقت پہلے پہل اس بات کی تخم ریزی ہوئی کہ زکوٰۃ کی رقم بطور خود خرچ کر ڈالی جائے۔ کیوں کہ غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی مگر ساتھ ہی فقہا نے اس پر بھی زور دیا کہ جن ملکوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں رہی ہے اور اعادۂ حالت فوراً ممکن نہیں ہے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کرلیں تاکہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے معدوم نہ ہوجائے۔

لیکن افسوس ہے کہ بعد کو بتدریج اس نظام کی اہمیت سے مسلمان غافل ہوتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہوئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا زکوٰۃ نکالنے کا معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ خود حساب کر کے ایک رقم نکال لیں اور پھر جس طرح چاہیں خود ہی خرچ کر ڈالیں حالانکہ جس زکوٰۃ کی ادائیگی کا قرآن نے حکم دیا ہے اس کا قطعاً یہ طریقہ نہیں ہے اور مسلمانوں کی جو جماعت اپنی زکوٰۃ کسی امین زکوٰۃ یا بیت المال کو حوالے کرنے کی جگہ خود ہی خرچ کر ڈالتی ہے۔ وہ دیدہ دانستہ حکم شریعت سے انحراف کرتی ہے۔ اور یقیناً اس کے لیے عنداللہ جواب دہ ہوگی۔

اگر کہا جائے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے مسلمان مجبور ہوگئے اور انفرادی طور پر خرچ کرنے لگے۔ تو شرعاً وعقلاً یہ عذر امسموع نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کردیا گیا۔ قیام امام وسلطان کی موجودگی پر موقوف تھا۔ تو زکوٰۃ کا نظام کیوں ترک کردیا جائے؟ کس نے مسلمان کے ہاتھ اس بات سے باندھ دیئے تھے۔ کہ اپنے اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب کرلیں یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق ہوجائیں۔ یا اقلاً ویسی ہی انجمنیں بنالیں جیسی انجمنیں بے شمار غیر ضروری باتوں

کے لیے بلکہ بعض حالتوں میں بدع ومحدثات کے لیے انہوں نے جا بجالی ہیں۔

اسلام نے اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا جہاں اس کے چند خانے بگڑے سمجھ لو پورا نقشہ بگڑ گیا چنانچہ اس ایک نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کر دی ہے لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح کے ہنگامے بپا کرتے ہیں۔اور سمجھتے ہیں انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعہ کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈ نکالیں سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقہ کا کھوج لگائیں!

درازی شب و بیداری من ایں ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تو کجا خفتست

اگر محض دولتمند افراد کے لیے عطیون اور قومی انجمنوں کے نظام سے قوم کا اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو آج یورپ اور امریکہ سے بڑھ کر کون ہے جو ان دونوں باتوں کا انتظام کر سکتا ہے؟ لیکن معلوم ہے کہ ان کا کوئی قومی فنڈ اور کوئی قومی نظام بھی نچلے طبقوں کی بیکاری اور مفلس طبقوں کا افلاس روک نہ سکا۔اور اگر اجتماعی مسئلہ کا ہلاکت آفریں خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔اصل یہ ہے کہ افراد کی وقتی فیاضیاں کتنی ہی زیادہ ہوں قوم کی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے کبھی کفیل نہیں ہو سکتیں۔اس صورت حال کا علاج صرف وہی ہے جو اسلام نے تیرہ سو برس پہلے تجویز کیا تھا یعنی قانون سازی کے ذریعہ قوم کی پوری کمائی کا ایک حصہ کمزور افراد کی خبر گیری کے لیے مخصوص کر دینا۔کہ ﴿ تُوخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هُمْ فَتَرَدُّ اِلٰى فُقَرَآئِهِمْ كَیْ لَايَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءَ مِنْكُمْ ﴾

بہر حال یہ بات یاد رہے کہ زکوٰۃ کی نوعیت عام خیرات کی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے پورے معنوں میں ایک انکم ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت نے ہر کمانے والے پر لگا دیا تھا۔بشرطیکہ اس کی کمائی اس کی ذاتی ضروریات زندگی سے زیادہ ہو۔

موجودہ زمانے کے انکم ٹیکسوں میں اور اس میں صرف دو باتوں کا فرق ہے ایک یہ

کہ اپنی نوعیت میں زیادہ وسیع ہے یعنی صرف کاروبار کی گھٹتی بڑھتی آمدنی ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ اندوختہ پر بھی واجب ہو جاتا ہے۔ اگر چہ اس سال کوئی نئی آمدنی نہ ہوئی ہو نیز اس طرح کی تمام ملکیتیں بھی اس میں داخل ہیں۔ جو بڑھنے کی استعداد رکھتی ہوں۔ مثلاً مویشی۔ دوسری یہ کہ مقصد کے لحاظ سے یہ ایک خاص مصرف رکھتا ہے جس کی مختلف صورتیں معین کر دی گئی ہیں اسٹیٹ کو حق نہیں کہ ان مصارف کے علاوہ کسی دوسرے مصرف پر خرچ کرے۔

قرآن نے یہودیوں کی اس گمراہی کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے احکام شرع کی تعمیل سے بچنے کے لیے شرعی حیلے نکال لیے تھے۔ افسوس ہے مسلمانوں میں بھی اس گمراہی نے سر اٹھایا حتیٰ کہ حیلہ کا معاملہ بعض کتب فقہ کا ایک مستقبل باب بن گیا۔ ازاں جملہ ایک حیلہ زکوٰۃ کے باب میں بھی مشہور ہے۔ طریقہ اس کا یہ بتلایا جاتا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ سے بچنا چاہے وہ کسی آدمی سے بخش دینے اور بخشوا لینے کا فرضی معاملہ کر لے۔ اور قبل اس کے برس پورا ہو۔ اپنا تمام مال اس کے نام ہبہ کر دے۔ پھر وہ برس ختم ہو جانے سے پہلے وہی مال ہبہ کر دے گا۔ کہ دونوں پر سے باوجود مالدار ہونے کے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ مثلاً شوہر نے اپنی بیوی سے رجب کے مہینہ میں کہہ دیا۔ میں نے اپنا مال تجھے ہبہ کر دیا۔ اس نے کہا قبول اب شوہر زکوٰۃ نہیں رہی کیونکہ قبل اس کے کہ سال تمام ہو جو صاحب نصاب نہ رہا۔ البتہ بیوی پر پڑ گئی بشرطیکہ بارہ مہینے گذر جائیں لیکن وہ بارہ مہینے کیوں گذرنے دیگی۔ وہ جمادی الاولیٰ میں شوہر سے کہہ دیگی میں نے تمام مال اب تمہیں ہبہ کر دیا۔ اس طرح نیک بخت پر سے بھی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردسر بسیار بود

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ احکام شرع کی تکمیل میں اس طرح کی حیلہ بازیاں نکالنی فسق و ضلالت کا انتہائی مرتبہ ہے۔ اور جو شخص اس طرح کی مکاریاں کر کے احکام الٰہی سے بچنا چاہتا ہے۔ اس کی معصیت ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ ہے جو سیدھی سادھی طرح ترک اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ ایک شخص سے جرم ہو گیا محض جرم ہے مگر یہ بات

کہ ایک شخص جرم کو بے جرمی و پاک عملی بنا کر کرتا ہے۔ صرف جرم ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور اس کی عملی زندگی ہی کو نہیں بلکہ ایمان وفکر کو بھی تاراج کر دینے والا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جونہی اس طرح کے حیلوں کا چرچا پھیلا تمام سلفِ اُمت نے اس پر انکار عظیم کیا اور آئمہ وفقہا میں کوئی نہیں جس نے انہیں جائز رکھا ہو ایک اور غلط فہمی اس باب میں یہ پھیل گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اپنے مفلس رشتہ داروں کی خبر گیری کا یہی طریقہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم سے ان کی مدد کی جائے۔

بلاشبہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ غیروں سے پہلے اپنے محتاج رشتہ داروں کی خبر لے اور قرآن نے صدقات وخیرات کے معاملہ میں جو اصلاحات کی ہیں منجملہ ان کی ایک بڑی اصلاح یہ ہے کہ رشتہ داروں کی اعانت کو بھی خیرات قرار دیا بلکہ خیرات کا سب سے پہلا اور بہتر مصرف ﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ (۲:۲۱۵) لیکن زکوٰۃ جو خیرات کی ایک خاص قسم ہے اس لیے واجب نہیں کی گئی ہے کہ لوگ خیرات کی دوسری قسموں سے ہاتھ روک لیں او اپنے محتاج رشتہ داروں کی مدد کا بوجھ بھی اس پر ڈال دیں زکوٰۃ وہی دے گا جو صاحب استطاعت ہو اور اگر ایک شخص خوشحال ہے اور اس کے رشتہ دار تنگی ومحتاجی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کرے اگر نہیں کرے گا تو یقیناً عند اللہ جواب دہ ہو گا کیوں کہ صلہ رحمی کا حق خدا کا ٹھہرایا ہوا حق ہے۔﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامُ﴾ (۴:۱) بلاشبہ اس کی خبر گیری اس کے لیے خیرات کا بہترین عمل ہو گی۔ لیکن خبر گیری ہر حال میں اس کا اسلامی فرض ہے یہ طریقہ کسی حال میں بھی شرعی نہیں ہو سکتا کہ باوجود خوشحال ہونے کے اپنے رشتہ داروں کو فقر وفاقہ میں چھوڑ دیا جائے اور پھر اگر کچھ دیا جائے تو اسے زکوٰۃ کی مد میں شمار کر لیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو گئی ہے۔ ان کی فکری حالت غیر اسلامی ہے ان کی عملی

رفتار غیر اسلامی ہے۔ ان کا دینی زاویہ نگاہ غیر اسلامی ہو گیا ہے وہ اگر اسلامی احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں۔ تو غیر اسلامی طریقہ سے اور یہ دینی تنزل کی انتہا ہے ﴿فَمَا لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾؟

ایک عام اور سب سے زیادہ مہلک غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے کے بعد انفاق و خیرات کے اور تمام اسلامی فرائض ختم ہو جاتے ہیں جہاں ایک شخص نے رمضان میں اٹھنیوں اور روپوں کی پڑیں باندھ کر تقسیم کے لیے رکھ دیں سال بھر کے لیے ہر طرح کے انسانی و اسلامی تقاضوں سے چھٹی مل گئی؟

حالانکہ ایسا سمجھنا یک قلم اسلام کو بھلا دینا ہے اسلام نے مسلمانوں کو جس طرح کی زندگی بسر کرنے کے تلقین کی ہے وہ محض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ ہی کی زندگی نہیں ہے بلکہ منزلی' خاندانی' معاشرتی جماعتی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کی ایک پوری آزمائش ہے۔ اور جب تک ایک انسان اس آزمائش میں پورا نہیں اترتا اسلامی زندگی کی لذت اس پر حرام ہے۔

اس پر اس کے نفس کا حق ہے۔ اس کے والدین کا حق ہے رشتہ داروں کا حق ہے بیوی بچوں کا حق ہے ہمسایہ کا حق ہے اور پھر تمام نوع انسانی کا حق ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی استطاعت اور مقدور کے مطابق یہ تمام فرائض ادا کرے اور انہیں فرائض کی ادائیگی پر اس کی زندگی کی ساری دینوی اور اخروی سعادتیں موقوف ہیں۔

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (۴:۳۶)

یہ تمام فرائض ادا نہیں کیے جا سکتے۔ جب تک کہ انفاق و خیرات کے لیے انسان کا ہاتھ کشادہ نہ ہو جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اعمال میں سے کسی عمل پر اتنا زور نہیں دیا

جس قدر نماز اور انفاق پر۔

اور منافقوں کی سب سے بڑی پہچان اس صورت میں یہ بتائی کہ ان کی مٹھیاں بند رہتی ہیں۔ انفاق کے لیے کھلتی نہیں ﴿وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ﴾ (۹:۶۷) اور اگر کچھ دیتے بھی ہیں تو مجبور ہو کر ﴿وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ﴾ (۹:۵۴)

اور مومنوں کی نسبت فرمایا:۔

﴿يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾ (۲:۲۷۴)

مومن وہ ہیں جن کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے رات دن پوشیدہ اور ظاہر ہر حال میں سرگرم انفاق رہتے ہیں۔

نیز فرمایا۔ کہ یہ شیطانی خیال ہے کہ خرچ کرنے سے ہم محتاج ہو جائیں گے اور اس راہ بخل "فحش" ہے یعنی سخت قسم کی برائی اور اللہ نفاق کا حکم دے کر تمہیں مغفرت و خوشحالی کی راہوں پر لگاتا ہے۔ ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً وَفَضْلًا﴾ (۲:۲۶۸)

پس یہ سمجھنا کہ جہاں سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ کا ٹیکس دے دیا۔ انفاق فی سبیل اللہ کے تمام مطالبات پورے ہوئے صریح قرآن کی تعلیم سے اعراض کرنا ہے زکوٰۃ تو ایک خاص قسم کا ٹیکس ہے اور ایک خاص مقصد کے لیے لگایا گیا ہے جو سال میں ایک مرتبہ دینا پڑتا ہے لیکن ہماری زندگی کا ہر چوبیس گھنٹہ ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے اور اگر ہم اسلامی زندگی کا توشہ لے کر دنیا سے جانا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ جب استطاعت اس کے تمام مطالبات پورے کریں۔

دنیا میں دولت اور وسائل و دولت کا احتکار اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ضروری تھا کہ اس کا ردِ فعل پیدا ہو۔ چنانچہ اٹھارویں صدی میں موجودہ سوشلزم کی بنیادیں پڑیں۔ اور اب

اس نے کمیونزم کی انتہائی صورت اختیار کر لی ہے اور پندرہ برس سے روس میں اس کا اولین تجربہ بھی ہو رہا ہے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کی تعلیم سرمایہ داری کے مفاسد مٹانا چاہتی ہے اور دولت کی تقسیم کی جاتی ہے تو کیا ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کہ اس کا رخ اسی طرف ہے جس طرف سوشلزم جا رہا ہے؟ بلاشبہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن ایک خاص درجہ تک اور اس کی حقیقت سمجھ لینی چاہیے۔

دو صورتیں ہیں اور ضروری ہے کہ دونوں کا فرق ملحوظ رکھا جائے ایک صورت یہ ہے کہ:۔

دولت اور وسائلِ دولت کا احتکار روک دیا جائے اور ہر کمانے والے فرد کو قانون سازی کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ اپنی کمائی کا ایک حصہ کمزور افراد کے لیے نکالے نیز سٹیٹ کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے کہ کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے لیکن ساتھ ہی یہ اصل بھی تسلیم کی جائے کہ مصیبت کے لحاظ سے تمام افراد و طبقات کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی اور یہ عدم یکسانیت کا اکثر حالتوں میں قدرتی ہے کیوں کہ سب کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں اور جب اس تعداد یکساں نہیں تو ناگزیر ہے کہ جدو جہد معیشت کے ثمرات بھی یکساں نہ ہوں بہ الفاظ دیگر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا جائے جو جس قدر حاصل کر سکتا ہے وہ اس کا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ:۔

صرف دولت کا احتکار ہی نہ روکا جائے بلکہ دولت کی انفرادی ملکیت بھی ختم کر دی جائے۔ اور ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں احباری قوانین کے ذریعے اقتصادی اور معیشتی مساوات کی حالت پیدا کر دی جائے مثلاً وسائلِ دولت تمام تر قومی ملکیت ہو جائیں انفرادی

قبضہ باقی نہ رہے اور جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف سے
معیشت کے مختلف ہونا بنائے حق تسلیم نہ کیا جائے۔

قرآن نے جو صورت اختیار کی ہے وہ پہلی ہے کہ اور سوشلزم جس بات کے لیے مسائی ہے وہ دوسری ہے دونوں کا مقصد یہ ہے کہ انسانی اکثریت کی شقاوت دور کی جائے دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے یعنی دولت کا احتکار روکا جائے لیکن دونوں کا طریق کار ایک نہیں۔ایک اختلاف معیشت سے تعرض نہیں کرتا اور اُسے قائم رکھ کر راہ نکالتا ہے دوسرا اسے مٹا دینا چاہتا ہے۔

اسلام اور سوشلزم کا یہ اختلاف اگر چہ محض درجہ ڈگری کا اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن تہ میں مبدا کا اختلاف بھی موجود ہے سوشلزم کا نظریہ یہ ہے کہ مدارج معیشت کا اختلاف کوئی قدرت اختلاف قدرتی ہے لیکن قرآن میں اس طرح کے اشارات جابجا پائے جاتے ہیں کہ یہ اختلاف نہیں ہے لیکن قرآن میں اس طرح کے اشارات جابجا پائے جاتے ہیں کہ یہ اختلاف قدرتی ہے اور ضروری تھا کہ ظہور میں آئے وہ کہتا ہے اگر یہاں سب کی حالت یکساں ہو جاتی تو تزاعم و تنافس کی حالت پیدا نہ ہوتی اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہوتی تو انسان کی قدرتی قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لیے کوئی شے متحرک بھی نہ ہوگی تو انسان کی قدرتی قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لیے کوئی شے متحرک بھی نہ ہوتی اور اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں ظہور میں نہ آتیں جن سے یہ تمام کارخانہ چل رہا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ الرَّحِيمٌ﴾(۱٦۵:٦)

(ترجمہ) اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تا کہ جو کچھ تمہیں دیا ہے۔اس پر تمہیں آزمائے بلا شبہ تمہارا پروردگار (بدعملیوں کی) فوراً سزا دینے والا ہے اور

بلاشبہ وہ بڑا ہی بخش دینے والا رحمت والا ہے۔

اس آیت میں تین باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔اولاً خدا نے انسانی زندگی کا کارخانہ کچھ اس طرح چلایا ہے کہ یہاں ہر گوشہ میں ایک طرح کی جانشینی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔یعنی ایک فرد اور ایک گروہ جاتا ہے دوسرا فرد اور گروہ اس کی جگہ لیتا اور اس کے ثمرات ونتائج سعی کا وراث ہوتا ہے۔ثانیاً مدارج معیشت کی یہ بلندی وپستی اس لیے ہوتی ہے تاکہ انسان کے عمل وتصرف کے لیے آزمائش کی حالت پیدا ہو جائے اور ہر فرد اور ہر گروہ کو موقع دیا جائے کہ اپنی سعی وکاوش سے جو درجہ حاصل کرسکتا ہے حاصل کرے آخر میں فرمایا ہے کہ خدا کا قانونِ جزا ست رفتار نہیں یعنی سعی وطلب کی سی امتحان گاہ سے جزاءِ عمل کا معاملہ وابستہ ہے جیسے جس کے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج اس کے حصہ میں آجائیں گے۔

اسی طرح جابجا قرآن میں پاؤ گے:۔

﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ (۱۶:۷۱) خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے ﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ (۴۳:۳۲) دینوی زندگی کی معیشت ہم نے لوگوں میں تقسیم کردی اور اس کا کارخانہ ایسا بنا دیا کہ سب ایک ہی درجہ میں نہیں ہیں۔کوئی کسی درجہ میں ہے کوئی کسی درجہ میں۔

بہر حال قرآن نے اجتماعی مسئلہ کا جو حل تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مدارج معیشت کی مساوات قائم کرنی نہیں چاہتا۔لیکن حق معیشت کی مساوات ضرور قائم کرنا ہے۔

یعنی وہ کہتا ہے:۔

یہ بات ضروری نہیں کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامان معیشت ملے
لیکن ضروری ہے کہ ملے سب کو اور سعی وترقی کی راہ یکساں طور پر
سب کے سامنے کھل جائے۔

اس نے ہر طرح کی نسلی، خاندانی جغرافیائی اور طبقاتی امتیاز مٹا دیئے۔اس نے

زندگی کے ہر میدان میں انسانی مساوات کا اعلان کر دیا۔ اس نے وہ تمام روکاوٹیں دور کر دیں۔ جو سوسائٹی کے اونچے طبقوں نے کمزور افراد کی خوشحالی و ترقی کی راہ میں پیدا کر دی تھیں۔ اس نے قانون سازی کے ذریعہ دولت کا احتکار و اختصاص روک دیا اس نے زندگی کے ہر گوشہ میں دولت کے اکتناز کی جگہ دولت کی تقسیم پر زور دیا اس نے اس بات سے قطعاً انکار کر دیا کہ دولت مند کا بجائے خود کوئی حق ہے اس نے سرمایہ داری کی تمام راہیں روک دیں۔ اس نے سود کی ہر شکل حرام کر دی۔ اس نے جوئے کو کسی حال میں جائز نہ رکھا پھر ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ کہ انسانی زندگی کے اعمال خیر میں انفاق فی سبیل اللہ کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی اور کمانے والے فرد کو سالانہ ٹیکس کے ذریعے مجبور کر دیا۔ کہ اپنی زندگی کی ایک حصہ دوسروں کے لیے بھی نکالے بس یہ نقشہ ہے۔ جو اسلام نے اجتماعی نظام کا بنایا ہے۔

لیکن سوشیلزم صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہنا چاہتا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ انفرادی ملکیت کی جگہ قومی ملکیت کا نظام قائم کر دے اور مدارج معیشت کا اونچ نیچ معدوم ہو جائے وہ یہ اصل تسلیم نہیں کرتا۔ کہ احوال معیشت کا اختلاف قدرتی ہے اور اجتماعی زندگی کی سرگرمی و ترقی کے لیے محور و محرک وہی ہے وہ کہتا ہے اس وقت تک حالت ایسی ہی رہی ہے لیکن اگر سوسائٹی کا نظام مساوات معیشت پر قربان کیا گیا۔ تو دوسری طرح کی ذہنی اور معنوی محرکات پیدا ہو جائیں گی اور کارخانہ معیشت کی سرگرمی اسی طرح جاری رہے گی جس طرح اس وقت تک جاری رہی ہے۔

دنیا کا اس وقت تک کا تجربہ اس کے خلاف ہے اور روس کا نیا تجربہ بھی اس وقت تک اپنے نظریوں کو عملیت کا جامہ نہیں پہنا سکا تاہم اس میں شک نہیں سوشلزم کو اس مطالبہ کا حق ہے کہ مزید تجربہ کا موقع دیا جائے۔

﴿وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ!﴾

سیرت کی عظمت

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور یہی سرگزشت کی اصلی شخصیت ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ایک خاص حقیقت کی جلوہ نمائی شروع ہو جاتی اور جس جس رُخ سے دیکھئے اور جہاں کہیں دیکھئے اس کی نمود سامنے آتی رہتی ہے یعنی انسان کی سیرت (کیریکٹر) کی فضیلت اور اس فضیلت کی اٹل کامرانیاں ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کے سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اور اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح وکامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی وہ اپنی راہ نکال لے گا دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں جب بھی اس کی رفتار نہیں رکے گی حوادث وقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے احوال وظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے افراد وجماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں اس کے لیے ہر حال میں کامرانی ہے اس کے لیے ہر گوشہ میں فتحمندی ہے۔ اس کے لیے ہر طاقت پر فرمانروائی ہے وہ اعمال ونتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اس لیے ہے کہ سربلند ہو، عجز ودرماندگی کی آلودگی کبھی سے چھو نہیں سکتی!

سترہ برس کا ایک کم سن لڑکا باپ کی آغوشِ محبت سے جبراً چھین لیا جاتا ہے اور اچانک اپنے آپ کو کن لوگوں میں پاتا ہے؟ ان میں جو چند سکوں کے بدلے اُسے غلام بنا کر بیچ رہے ہیں دنیا کی ایک لاکھ انسانی طبیعتیں ایسی حالت میں کیا کرتیں؟ مگر غور کرو اس نے کیا کیا؟ اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تجربہ کار دانشمند کی طرح اس نے صورتِ حال کا پورا جائزہ لے لیا ہو۔ اور پھر فیصلہ کر لیا ہو کہ جو حالت بھی پیش آ جائے۔ اسے صبر وسکون کے ساتھ جھیل لینا چاہیے۔ اور اسی کے مطابق کام کیے جانا چاہیے۔ قافلے

والوں نے انہیں غلام کی حیثیت میں پیش کیا۔ وہ ایک غلام کی طرح پیش ہو گئے عزیز مصر نے غلام کی طرح خرید کیا انہوں نے غلام کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔ اور اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنا چاہیے کہیں بھی کوئی ایسی بات مترشح نہیں ہوتی کہ ایسا کرنے میں انہیں کوئی تامل ہوا ہو گویا ناگہانی مصیبت جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے پوری زندگی کی سوگواری بن جاتی ان کے لیے کوئی مصیبت ہی نہ تھی باپ کے آغوشِ محبت سے نکل کر اچانک ایک اجنبی کا غلام بن جانا ان کے لیے ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنی مرضی سے زندگی کا ایک عیش چھوڑ کر دوسرا عیش اختیار کر لینا نہ پچھلی حالت کا ماتم ہے نہ موجودہ حالت سے جھجک نہ گزشتہ کی یاد میں سوگواری ہوئی نہ آئندہ کے اندیشہ میں بدحالی اس عازم اور بے پرواہ ملاح کی طرح جسے نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہے نہ آنے والے طوفان کا اندیشہ اس نے اپنی کشتی چلانی شروع کر دی۔ اور دیکھو بالآخر ساحل مقصود تک پہنچ کر رہی۔

حوادث و انقلاب کے ترکش میں اس سے بڑھ کر اور کونسا تیر ہو سکتا ہے جو اس پر چلایا گیا تھا؟ لیکن اس کے س صبر و عزم نے اسے پرکاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور اس طرح بے داغ نکل گیا۔ گویا گردش حوادث کا ہاتھ اس کے خلاف اٹھا ہی نہ تھا۔

چیں بر جبیں زجنشِ ہر خس نمی رسد دریا دلانِ چو موج گہر امیدہ اند

غور کرو پھر اس انسان کے لیے جو دنیا کی مصیبتوں اور موافقتوں میں اپنی راہ نکالنی چاہتا ہو۔ اس معاملہ میں کیسی عظیم الشان عبرت ہے؟ اگر حضرت یوسف نے مصائب و محسن کی پہلی ہی منزل میں صبر و عزم، اعتمادِ نفس اور توکل علی اللہ کی یہ روح عظیم اپنے اندر نہ پیدا کر لی ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ اس منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے جو بالآخر ان کی منزل مقصود ثابت ہوئی۔

پھر دیکھو زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائشیں پیدا کرتی رہیں اور ان کی غیر متزلزل اور بے داغ سیرت کس طرح فتحمندیوں پر فتحمندیاں حاصل کرتی گئی؟

سب سے پہلے عزیز مصر کے ساتھ ان کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ اس نے بحیثیت

غلام کے انہیں خرید کیا تھا۔ اور مصر کے آثار و نقوش ہمیں بتلا رہے ہیں کہ مصریوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا ہوا کرتا تھا۔ وہ غلاموں کے لیے اتنے ہی سنگدل تھے۔ جتنی سنگدل دنیا کی تمام پرانی قومیں رہ چکی ہیں تاہم انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اپنے حسن وسیرت سے اس کا دل مسخر کرلیا۔ کہ غلامی کی جگہ آقائی کرنے لگے اور اس نے بیوی سے کہا:۔

﴿ اَکْرِمِیْ مَثْوٰهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ﴾ (۲۱)

غور کرو یہ انقلابِ حال کیونکہ پیدا ہوگا ہوا۔ وہ کیسی وفاداری و دیانت اور راست بازی اور امانت شعاری ہوگی جس نے ایک مصری امیر کو اس درجہ متاثر کردیا۔ کہ ایک عبرانی غلام کو اپنے فرزند کی طرح چاہنے لگا اور اپنے تمام گھر بار اور علاقہ کا مختار کل بنا دیا؟

پھر امرأۃ العزیز کا معاملہ رونما ہوتا ہے پچھلی آزمائشِ ذہن ودماغ کی آزمائش تھی یہ جذبات کی تھی۔ اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا پہاڑوں کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا۔ آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا درندوں کے مقابلہ سے منہ نہیں موڑتا۔ تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن حضرت یوسف کی سیرت کی چٹان یہاں بھی متزلزل نہ ہوسکی ان کی بے داغ فضیلت پر نفسِ انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند لفظوں کے اندر صورت حال کی پوری تصور کھینچ دی ہے اور اگر ان اشاروں کی تشریح وبیان کو پورا جامہ پہنایا جائے تو کئی صفحوں کی داستان بن جائے۔ تم چشم تصور سے کام لو اور دیکھو ترغیبات کی قہرمانی وسلطانی کا کیا حال تھا۔ اور عیشِ نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر رُبا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی عمر عین عروج شباب کی عمر اور معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت کا طلب کا نہیں مطلوبیت کا پھر طلب بھی ہوئی تو کیسی طلب؟ دیوانگی کی طلب اور دل باختگی کا تعاقب پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مواقع

بہ کلی مرتفع ہو گئے۔ کوئی انسان آنکھ دیکھنے والی نہیں۔ کوئی پردہ حجاب حائل ہونے والا نہیں کون ہے جو ایسی حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو رکھ سکتا ہے؟ عفت و پاکی کا کونسان پہاڑ ہے جو ان بجلیوں کی تاب لا سکتا ہے؟ لیکن ایک پہاڑ تھا جسے یہ بجلیاں بھی خبش میں نہ لاسکیں یہ حضرت یوسفؑ کی سیرت تھی جو کسی حال میں بھی متزلزل نہیں ہو سکتی تھی خود امراۃ العزیز کے لفظوں میں (اور اس سے بڑھ کر اس معاملہ کا کون شاہد ہو سکتا ہے) ﴿اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ﴾ (۳۶) وہ اس حال میں بھی اپنی جگہ سے بے جگہ نہ ہوا۔ اس کو عصمت کے لیے ذرا سی بھی جنبش نہ تھی۔

پھر دیکھو امراۃ العزیز کی دعوت کے جواب میں جو کچھ ان کی زبان سے نکلا وہ کیا تھا؟ ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ﴾ (۲۳) تیرا شوہر میرا آقا ہے اس نے مجھ پر اعتماد کیا۔ عزت و احترام کے ساتھ رکھا پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے حسنِ سلوک کا بدلہ میں یہ دوں کہ اس کی امانت میں خیانت کرنے لگوں؟ غور کرو یہ برائی ایسی برائی تھی کہ اسے برائی دکھانے کے لیے کتنی ہی باتیں کہی جا سکتی تھیں۔

لیکن ان کا ذہن اسی بات کی طرف گیا اور اسی کو قرآن نے بھی نمایاں کر کے دکھایا اس سے معلوم ہوا کہ ان کی سیرت کا اصل جوہر یہیں ڈھونڈھنا چاہیے امانت داری راست بازی اور ادائے فرض کی روح فرض کی روح اس طرح ان پر چھائی ہوئی تھی کہ ہر موقع پر سب سے پہلے وہی سامنے آتی تھی۔

پھر اس کے بعد لائمات کا معاملہ پیش آتا ہے اب تک صرف ایک امراۃ العزیز ہی کا فتنہ تھا۔ دار الحکومت مصر کے تمام فتنہ گرانِ حسن جمع ہو گئے تھے کہ اُن کی متاعِ ضبط و تحمل کی غارتگریوں میں حصہ لیں۔

دائے برصید کہ یہ باشد و صیادے چند!

مگر یہاں بھی کیا نتیجہ نکلا؟ ﴿قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ﴾ (۳۱)

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

پھر دیکھوں راست بازی وحق پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کر لی تھی؟ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم ومعصیت سے اپنے کو نہیں روک سکتے لیکن اب حضرت یوسفؑ کے سامنے قید کی سزا اس لیے لائی جا رہی ہے جرم و معصیت سے کیوں اپنے آپ کو روک رہے ہیں لوگوں کو قید وبند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیشِ حیات ڈھونڈتے ہیں۔ اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہیے۔ لیکن حضرت یوسف کو اس لیے قید خانہ کی دھمکی دی جا رہی ہے۔ کہ عیشِ حیات نے اپنی ساری دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی اور انہوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔

یہ حضرت یوسفؑ کی سیرت کا سب سے عظیم مظاہرہ ہے۔ یہ عشقِ حق کا نمونہ ہے یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب ان کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کا عیش مگر معصیتِ حق کی راہ میں زندگی کے شدائد مگر راست بازی کی راہ میں تو ان کا فیصلہ قطعی اور بغیر کسی تامل کے یہ تھا کہ ﴿اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ﴾ (۳۳) قید خانہ مجھے محبوب ہے مگر وہ بات نہیں جس کی دعوت مجھے دی جا رہی ہے۔

ہمارے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت یوسفؑ کی بدشگونی تھی کہ خود قید خانہ کی بابت بول اٹھے۔ اگر جلدی میں آ کر ایسا نہ کہہ دیتے تو یہ ابتلا پیش نہ آتی۔ افسوس کس درجہ حقیقت فراموشی ہے! حضرت یوسفؑ کی جو بات ان کی پاکی وعظمت کا سب سے بڑا جوہر تھی۔ وہی ان حقیقت ناآشناؤں کی نظر میں ان کی لغزش ہوگئی گویا حضرت یوسفؑ کا قید خانہ کو معصیت پر ترجیح دینا اور اسے خوشی خوشی اختیار کر لینا کوئی ایسی بات تھی جو نہ ہونی چاہیے تھی اور صرف اس لیے ہوگئی کہ حضرت یوسفؑ نے بدشگونی کی بات کہہ دی تھی غور کرو قرآن کہاں ہے اور اس کے شارح کہاں پہنچ گئے ہیں۔

﴿نَزَلُوْا الْمَکَّۃَ فِیْ قَبَآئِلَ ھَاشِمَ اَوْنُزِلَتْ بِالْبَدَآءِ﴾ پھر دیکھو حضرت

یوسفؑ کی یہی سیرت ہے جو قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری کو بھی اسی طرح روشن کر دیتی ہے۔ جس طرح عزیز مصر کے ایوانِ عزت و اقبال کو اس نے روشن کر دیا تھا چونکہ چراغاں جہاں کہیں بھی رکھ دیا جائے روشنی ہی دے گا اور ہیرے کی چمک اس سے کم نہیں ہو جائے گی کہ جواہر خانہ شاہی میں رہنے کی جگہ کوڑے کرکٹ میں ڈال دیا گیا تو رات کی تصریح پڑھ چکے ہو کر قید خانہ کا افسر اُن کا معتقد ہو گیا تھا اور قید خانہ میں انہیں کی افسری قائم ہو گئی تھی۔

پھر دیکھو عین قید خانہ میں دعوتِ حق کا داعیہ اُن کے قلب مبارک میں اٹھتا ہے۔ اس وقت تک انہوں نے مصر میں دین حق کی تبلیغ نہیں کی تھی۔ اگر چہ خود اسی پر قائم تھے لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ خاندانی نبوت کا ان میں ظہور ہو چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب یکا یک اپنے قلب کو ولولہ تبلیغ سے معمور پایا لیکن یہاں کون تھا جو اس تبلیغ کا مخاطب ہوتا۔ صرف قید خانہ کے چند ساتھی تھے جو طرح طرح کے جرموں کی پاداش میں یہاں پہنچا دیئے گئے تھے مگر غور کرو انہوں نے رہائی کا انتظار نہیں کیا انہیں قیدیوں میں تبلیغِ حق شروع کر دی۔ اور اب مصر کا قید خانہ دعوتِ حق کی تعلیم و تربیت کی ایک درسگاہ بن گیا۔

پھر دیکھو تبلیغ حق کے جوش و طلب کا کیا حال ہے؟ دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص پیش خدمتوں میں سے تھے اور اپنا اپنا خواب بیان کرتے ہیں خواب سن کر حضرت یوسفؑ معلوم کر لیتے ہیں۔ کہ ایک کی رہائی قریب ہے دوسرے کی موت قریب ہے پس چاہیے کہ فرصت کا ایک لحہ بھی ضائع نہ کریں اور تعلیم حق سے انہیں آشنا کر دیں۔ ممکن ہے جو رہا ہونے والا ہے۔ وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے اور دربار شاہی میں تخم ریزی کر سکے جس کی موت قریب ہے ممکن ہے کہ سچائی قبول کرے اور دنیا سے جائے تو راہِ حق پر جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں انہوں نے خواب سنتے ہیں اس کی تعبیر نہیں بتلا دی بلکہ ان کی توجہ رجوع سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرا ہی بیان شروع کر دیا ﴿ اِنِّی تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ کَافِرُوْنَ ﴾ (۳۷)

ان کی سیرت کے اس مقام سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دعوتِ حق کا فریضہ کیوں

کرادا کرنا چاہیے۔ اور داعی کے جوش وطلبِ دعوت کا کیا حال ہوتا ہے قید خانہ کی زندگی بھی ادائے فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی۔ اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی۔ کہ میں کیوں کر قید سے رہائی پاؤں بلکہ تمام تر اس کی تھی کہ خدا کے بندے جہل وگمراہی سے کیونکر نجات پائیں؟ مہلت جب مکمل ملی اور جس حال میں ملی معاً اسی مقصد کے لیے کام میں لائی گئی اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا تھا۔ اسیطرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کر سکے جس کے سر پر اجل کی تلوار لٹک رہی تھی کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا قدرتی حق ہے اور زندہ رہنے والا ہو یا مر رہا ہو اسے اس کا حق فوراً ملنا چاہیے۔

پھر دیکھو معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اُسی منصب پر مامور ہونے والا ہے۔ معاً ان کا ذہن اُس طرف چلا گیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت وجلوت میں بادشاہ کے حضور میں رہنے والا ہے کتنا اچھا موقعہ حاصل ہوگا کہ پیامِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے؟ چنانچہ بیان کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا! ﴿ اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ ﴾ (۴۲) اپنے آقا کے پاس جائیو تو مجھے یاد رکھیو یعنی میرے یہ تعلیم ودعوت یاد رکھیو اور اپنے آقا سے بعنوان مناسب اس کا تذکرہ کر دیجیو۔ ممکن ہے کہ پیامِ حق کام کر جائے۔

عام طور پر حضرت یوسفؑ کے اس قول کا یہ مطلب سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنی اپنے آقا سے میری سفارش کیجیو لیکن جس محل میں یہ بات کہی گئی ہے اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی قیدیوں سے جو کچھ بھی ان کی گفتگو ہوئی ہے یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دینِ حق کے بارے میں ہے اس کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ اُنہوں نے اپنے قید محن کے مصائب کا کوئی ذکر کیا ہو۔ بس اس بات کا وہی مطلب موزوں معلوم ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی صاف ہوئی کہ قیدیوں کا خواب سن کر آپ نے تعبیر فوراً کیوں بیان

نہیں کردی تھی مفسرین کہتے ہیں۔تاخیر اس لیے کی کہ وحی کا انتظار تھا لیکن اگر آپ انتظار کی حالت میں ہوتے تو اس وثوق کے ساتھ کیوں کر وعدہ کر لیتے کہ ﴿لَا یَاْتِیْکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ﴾ (۳۷) اور فیضانِ وحی سے تو آپ کا قلب معمور ہو رہا تھا تعبیر کے لیے انتظار کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی ہے۔صاف صاف بات یہی ہے کہ تاخیر قصداً کی تھی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج نے ان دونوں کو میری طرف متوجہ کر دیا ہے۔چاہیے کہ اس توجہ سے فوراً فائدہ اٹھایا جائے۔ارو دین حق کی راہ چھیڑ دی جائے چنانچہ اس کا ذکر اس مناسبت سے شروع کر دیا۔﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ (۳۷) یعنی خواب کی تعبیر میں بہت جلد بتادوں گا کیونکہ پروردگار نے مجھے اس کا علم دیا ہے۔لیکن میرے علم کو اس طرح کا علم نہ سمجھنا جس طرح اپنے کاہنوں اور جادوگروں کا سمجھا کرتے ہو۔میری راہ دوسری ہے میں تمہارے طریقہ پر کاربند نہیں۔پھر اس طرح بات میں سے بات نکالتے ہوئے دین حق کی دعوت شروع کر دی کہ ﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾

پھر دیکھو۔اس سیرت کی فضیلت کا کیسا عجیب منظر سامنے آ جاتا ہے جب بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے کہ اور سردار ساقی آ کر یہ معاملہ انہیں سناتا ہے دنیا کا ہر انسان ایسے موقعہ پر کیا کرتا دنیا کا ہر وہ قیدی کیا کرتا ہے جسے بغیر کس جرم وگناہ کے قید خانے میں ڈال دیا گیا ہو اور سالہا سال سے اس حالت میں بے یارو مددگار پڑا ہو؟ یقیناً اسے تائید غیبی سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا اور کہتا میں یہ مشکل حل کر سکتا ہوں مجھے یہاں سے نکلنے اور بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کا موقع دیا جائے۔مگر ہم دیکھتے ہیں حضرت یوسف کی جانب سے کوئی اس طرح کی خواہش ظاہر نہیں ہوئی۔انہوں نے خواب سنتے ہیں اس کی تعبیر بیان کر دی۔اس کا خیال بھی انہیں نہیں گزرا کہ اپنی مطلب براری کی یہ نہایت قیمتی بات تھوڑی دیر کے لیے بھی روک لوں پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ جتنی بات پوچھی گئی تھی بتلا دی کہ بلکہ اس

سے بھی زیادہ علم وفضل کی بخشش مسائل کے دامن میں ڈال دی یعنی خواب میں ایک آنے والی ہولناکی کی خبر دی گئی تھی انہوں نے تعبیر کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ اس ہولناک مصیبت سے بچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے سوال بادشاہ کی طرف سے تھا لیکن دیکھو جس نے جواب دیا وہ قید خانہ کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوا اپنے علم وفضیلت کی بخشش میں بادشاہوں سے بھی زیادہ فیاض تھا۔

عدیل ہمت ساقی ست فطرت عُرفی
کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن ست

حضرت یوسفؑ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ دنیا نے ان کے ساتھ کچھ ہی کیا ہو وہ دنیا کی خدمت و ہدایت کے سوا اور کوئی شے اپنے سامنے نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب انہوں نے خواب سنا اور خواب کا حل ان کے علم وبصیرت نے معلوم کرلیا تھا تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی علم و ہدایت کا فیضان انسانوں پر نہیں روک سکتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ جب کبھی طلب اعانت کا ہاتھ ان کے آگے بڑھے وہ اس کی دستگیری کریں اور انہوں نے دستگیری کی اگر نہ کرتے تو داعی حق نہ ہوتے۔ ان کا بے لوث جذبہ خدمت اس خودغرضانہ مطلب برآری کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک انسان کی مشکل اور احتیاج کو اپنی رہائی کا ذریعہ بنائیں۔

پھر جب بادشاہ ملاقات کا مشتاق ہوا اور اپنا پیامبر بھیجا تو چاہیے تھا کہ جوشِ مسرت سے اس پیام کا استقبال کرتے کیوں کہ اب خودبخود رہائی سامنے آ گئی تھی اور ایسی حالت میں آئی تھی کہ بادشاہ وقت مشتاقِ زیارت ہو رہا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کی نگاہوں میں معاملہ نے دوسری ہی شکل اختیار کی۔ انہوں نے قید خانہ چھوڑنے اور بادشاہ کی ملاقات سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ پہلے میرے معاملہ کی تحقیقات کر لی جائے۔

اب یہاں پھر بے اختیار یہی سوال سامنے آ جاتا ہے کہ دنیا کا ہر مظلوم قیدی ایسی حالت میں کیا کرتا اور اس پیکر صدق وصفا نے کیا کیا؟ غور کرو۔ ان کی سیرت کیسے جوہروں سے گوندھی گئی تھی۔ اور کس طرح صبر وضبط کی عدیم النظیر قوتوں کے ساتھ خودداری اور عزتِ

نفس کی روح اس کے ایک ایک ذرے میں رچی ہوئی تھی؟ حضرت یوسفؑ کے اس انکار میں ان کی اخلاقی ذہنیت کی پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ قید سے رہائی بلاشبہ ایک خوشخبری ہے لیکن ایسی رہائی مجھے کیا خوش کر سکتی ہے جو میرے بے جرمی کے وجہ سے ظہور میں نہ آ رہی ہو بلکہ محض بادشاہ کا ایک عطیہ اور بخشیش ہو؟ میں تھا تو مجرم لیکن چونکہ بادشاہ نے خواب دیکھا کسی سے تعبیر بن نہ آئی میں نے بتلا دی۔ اس لیے خوش ہو کر بادشاہ نے رہا کر دیا بس یہ بادشاہ کا احسان ہوگا حق وانصاف کا فیصلہ نہ ہوا نہیں میں اپنی رہائی بطور ایک احسان کے قبول نہیں کر سکتا۔ اگر میں مجرم ہوں تو سزا کا سزاوار ہوں کیوں مجھے کوئی بخشے؟ اگر مجرم نہیں ہوں تو میرے بے جرمی کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس لیے رہا کرنا چاہیے کہ سزا کا مستحق نہ تھا اس لیے نہیں کہ کسی نے بخش دیا۔

عزتِ نفس اور استقامت حق کا کس قدر بلند مقام ہے اور اخلاقی سیرت کی کیسی عجیب مضبوطی ہے جس میں کہیں سے بھی کوئی لچل پڑتی دکھائی نہیں دیتی؟ جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو اس کی بے داغ خصوصتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں۔ اور اس سورج کی روشنی کبھی مدہم نہیں پڑ سکتی!

﴿كَاَنَّهٗ عِلْمٌ فِيْ رَاْسِهٖ نَارٌ﴾

فی الحقیقت جمال یوسف کی یہی رعنائیاں تھیں جنہوں نے ایک ہی نظارے میں بادشاہ کا دل مسخر کر لیا تھا۔ ﴿اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ﴾ (۵۴)

پھر سب سے آخر میں اس موقع کا مطالعہ کرو۔ جب حضرت یوسف کے بھائی ان کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ کون بھائی؟ جنہوں نے قتل کا سامان کیا اور پھر غلام بنا کر اجنبیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا کس کے سامنے؟ اسی مظلوم کے سامنے جو آج مظلوم نہیں ہے بلکہ وقت کی سب سے بڑی مملکت کا مالک اور قحط سالی کی سب سے بڑی مصیبت میں سامان زندگی کا بخشنے والا ہے کیسا عجیب موقعہ تھا اور نفس انسانی کے لیے ولولہ انتقام کی کیسی صبر آزما آزمائش؟ تاہم غور کرو اول سے لے کر آخر تک حضرت یوسف کا طرز عمل کیسا رہتا

ہے؟ کہیں بھی کوئی بات ایسی دکھائی دیتی ہے کہ کہہ سکو بغض و انتقام کے جذبہ کی کوئی ہلکی سی بھی پرچھائیں پڑ رہی ہے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو ان کے لیے سرتاپا شفقت و رحمت ہو گئے تھے۔ انتقام و سرزنش کا کیا ذکر ہے۔ ان کی زبان سے تو ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلا جس سے بھائیوں کے دلوں کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی صاف نظر آ رہا ہے کہ ان کی شرمندگی اور پشیمانی کا زخم ان سے کہیں زیادہ خود ان کے دل پر لگ رہا ہے۔ اور اب فکر ہے تو اس بات کی کہ کس طرح ان کے دلوں کے لیے تسکین خاطر کے سامان پیدا کر دیں۔

جب تیسری مرتبہ بھائی آئے اور اپنی مصیبتوں کی داستان سنائی ﴿مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ﴾ اور پھر دستِ سوال بڑھایا کہ ﴿وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ﴾ (۸۸) تو جوش محبت سے بیقرار ہو گئے۔ اس وقت ان کے سامنے اور کوئی بات نہ تھی۔ صرف یہ تھی کہ میرے بھائی فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ میں مسندِ عزت پر بیٹھا ہوں اور وہ دریوزہ گروں کی طرح دستِ سوال دراز کئے ہوئے ہیں بے اختیار اُن کا جی چاہا کہ اپنے آپ کو ظاہر کر دیں ﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ﴾ تمہیں وہ بات بھی یاد ہے جو یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کی تھی؟ کہنے کو تو یہ کہہ گئے۔ اور یہ کہے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ کیوں کہ یاد دلانا تھا کہ مصر کیونکر پہنچا لیکن معاً خیال ہوا کہ اس معاملہ کی یاد میں ان کے لیے سرتاسر سرزنش و خجالت ہے اس لیے فوراً ایک ایسی بات کہہ دی۔ کہ ان کے لیے ایک معذرت کا پہلو نکل آئے اور شرمندگی کا بوجھ محسوس نہ کریں! ﴿اِذْ اَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ﴾ (۸۹) یہ اس وقت کی بات ہے جب تمہارا نادانیوں کا زمانہ تھا یعنی کس معاملہ پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ نادانیوں کے زمانہ کی ایک بات ہے اور دنیا میں کون ہے جس پر کوئی نہ کوئی زمانہ نادانیوں کا نہ گزرا ہو؟

یہ سنتے ہیں جب انہوں نے پہچان لیا اور عجز و ندامت کا سر جھکا کر بولے ﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ﴾ (۹۱) تو بلاتامل جواب ملا ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ. يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (۹۲) نہیں

آج کا دن بچھڑے ہوؤں کے ملنے اور ٹوٹے ہوئے رشتے جڑنے کا دن ہے ملامت والزام کی باتوں کا یہاں گزر نہیں میرا دل تو ہر طرح کی رنجشوں سے صاف ہے باقی رہا خدا کا معاملہ تو اس کے لیے بھی میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں وہ تمہارے سارے قصور بخش دے گا اور وہ ضرور بخش دے گا کیونکہ اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور کون ہے۔

پھر آگے چل کر جب وقت آیا کہ اللہ کے فضل وکرم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گزرتے ہوئے واقعات کی طرف اشارہ کریں تو دیکھو اس معاملہ کی طرف کیوں کر اشارہ کرتے ہیں ﴿مِنۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ﴾ (۱۰۰) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا۔ یعنی اول اس معاملہ کو شیطان کی طرف منسوب کر دیا کہ بھائیوں پر بوجھ نہ پڑے۔ گویا یہ شیطان کا ایک فتنہ تھا ورنہ میرے بھائی ایسا کیوں کرتے؟ پھر سارے معاملہ کو محض ایک طرح کے اختلاف سے تعبیر کیا تاکہ اصل واقعہ کی شناخت کم ہو جائے پھر جتنا کچھ بھی ظاہر کیا وہ اس طریقہ پر کیا کہ مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف پڑ گیا تھا گویا یہ بھائیوں کا بلا وجہ جور وستم نہ تھا کوئی ایسی بات تھی جیسے بھائیوں میں باہمدگر پیش آ جایا کرتی ہیں اور دونوں جانبوں کو اختلاف کے وجوہ میں دخل ہوتا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ہی جانب کا قصور تھا۔

غور کرو عفو وبخشش کا وہ کیسا مقام ہے ہمت کا وہ کیسا علو ہے ظرف کی وہ کیسی پہنائی ہے؟ خلق کی وہ کیسی عظمت ہے جو روشنی کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتی ہے؟ او جس سیرت کا یہ حال ہے اس کے لیے فضیلت کی اور کونسی بات رہ گئی؟

شنید کہ مردان راہِ کدا ——— دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام ——— کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

مظلومی وبیچارگی کی حالت میں صبر کر لینا بلاشبہ ایک بڑائی ہے لیکن طاقت واختیار کی حالت میں بدلہ نہ لینا اور بخش دینا سب سے بڑی بڑائی ہے۔ ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (۴۳۔۴۳) اور اس سیرت کی عظمت

میں دونوں مقام جمع ہو گئے جب بیچارگی تھی تو اُف تک نہ کی جب طاقت ملی تو انتقام کا وہم وگمان بھی نہ گزرا اور بلاشبہ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اسوۂ حسنہ ہے۔

سب سے آخر میں ان کی دعا نمایاں ہوتی ہے جس میں اُن کی سیرت کا ایک ایک خط وخال دیکھ لیا جا سکتا ہے عظمت وکامرانی کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی جو صدا ان کے دل ودماغ سے نکل سکتی تھی وہ یہ تھی کہ ﴿فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ﴾ (۱۔۱) یعنی زندگی کی ساری کامرانیوں کا آخری ماحصل جس کی طلب وآرزو سے کبھی دل خالی نہیں ہو سکتا یہی ہے کہ اطاعتِ حق پر خاتمہ ہو اور الحاق ان کے ساتھ ہو جو تیرے صالح بندے ہیں۔

مذہب کی دُکان

مذہب کے دوکانداروں نے جہل وتقلید اور تعصب وہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیال وتحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد وبے قیدی کو حکمت واجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے نہ محراب مسجد میں اخلاص اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق وصفا ان سب سے الگ ہیں۔ اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دوسری ہے۔

ہم کعبہ وہم تبکدہ سنگِ رہ مابود
رفتیم صنم برسرِ محراب شکستیم!

ہمارا عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام بانیان ادیان وملل میں سے کسی نے بھی شرک وانسان پرستی کی تعلیم نہیں دی تھی پرانی سے پرانی بات جو دنیا میں کہی گئی ہے صرف سچائی اور خداپرستی ہے لیکن معلوم ہے کہ ان کے ماننے والوں نے شرک وبت پرستی کا راستہ اختیار کیا اور اپنی ساری کج فہمیوں کو ان ہی کی جانب منسوب کر دیا۔ جب انبیاء کرام علیہم السلام کی صاف صاف تمثیلوں کو کیا سے کیا بنادیا تو پھر عامہ مصلحین امت ومصلحانہ طریق کہ بیچارۂ کارودرماندۂ احوال ودل باختہ کشاکش تکوین وتمکین ہیں۔ اس فتنہ سے کیوں کر بچ سکتے ہیں؟ آں کس ست اہل بشارت کہ اشارت داند۔ دراعتقاد سید محمد جونپوری ہر کمالیکہ محمد رسول اللہ ﷺ داشت۔ سید محمد رانیز بود۔ فرق ہمیں ست کہ آنجا باصالتہ بود ایں جا بہ جمعیت ' وبہ تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو ارشدٗ

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ ہمارے زمانے میں مرزا صاحب قادیانی کے معتقدین میں سے ایک بڑا گروہ بھی مرزا صاحب کی نسبت

بعینہ یہی اعتقاد رکھتا ہے اور اسی اصالتاً اور تبعیہ کے فرق پر اپنے تمام غلو و اغراق کی بنیاد رکھی ہے۔ ﴿وَمَآ اَشْبَهُ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ﴾ اور بہتوں کا معاملہ دعاوی و شطحیات تک پہنچ گیا ہے ﴿وَكَلَامُ الْكُبَارِيْ يُحْمَلُ وَلُصَرِفِ عَنِ الظَّاهِرِ﴾ کسی نے اسی عالم میں کہا ﴿لوائی ارفع من لواء محمد اور سبحانی سبحانی ما اعظم شانی کوئی پکار اٹھا ﴿لَيْسَ فِيْ جُبَّتِيْ اِلَّا اللّٰهُ﴾ اور کوئی بول اٹھا ﴿بَطْشِيْ اَشَدُّ مِنْ بَطْشِ اللّٰهِ﴾ یہ بھی کہا گیا کہ جئنا ﴿بَحْرًا وَقَفَ الْاَنْبِيَآءِ عَلٰى سَاحِلِهٖ﴾ اور یہ تو مشہور و معروف ہے کہ ﴿قَدَمِيْ هٰذِهٖ عَلٰى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللّٰهِ﴾

کیونکہ کسی غیر معصوم کا قابلِ احترام و اتباع ہونا اس کے لیے متلزم نہیں کہ اس کا ہر قول و حال حجت ہوا۔ اور نہ کسی غیر معصوم کے کسی ایک قول و اجتہاد کا غلط ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے تمام محاسن اقوال و اعمال کر ترک کر دیا جائے قرآن حکیم نے سچے مومنوں کی جو شان بتلائی ہے وہ ان کی اس طلب دعا سے ظاہر ہے ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ پس جب عام مومنوں کی نسبت یہ حکم ہے۔ تو اصحاب علم و فضیلت کی طرف سے دل میں غل و بغض کا ہونا کب جائز ہو سکتا ہے۔

البتہ اصل مرکز حق و یقین کتاب سنت ہے یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ سب کو اس کی خاطر اپنی جگی سے ہل جانا پڑے گا اس چوکھٹ کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا سب کی چوکھٹیں اس کی خاطر چھوڑ دینی پڑیں گے ﴿لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ جب نص رسول کے مقابلہ میں کسی دوسرے انسان کی پاسداری کی رسول احب کب باقی رہا؟ ارباب افراط و غلو کی ساری غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معصوم پیشواؤں کے اقوال و احوال کو بمنزلہ اصل مرکز بنا لیتے ہیں جس کو کسی حال میں اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا اور پھر چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی و صاحب وحی کی نص کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ مرکز تک لے جائیں اور نہ جا سکیں تو زبردستی کھینچ کر لے جائیں اس پر ستم یہ کہ اس طریق کو طریق و تطبیق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگر یہ تطبیق ہے تو ﴿وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ﴾ کہ پھر دنیا میں تحریف کا وجود باقی نہ رہا۔ اور نہ کبھی اہل کتاب نے اس دنیا میں تحریف کی۔

افسوس کہ جزئیات مزعومہ عقائد کے غرور باطل نے مسلمان کو جس قدر نقصان پہنچایا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عمل صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی۔ اور سارا دارومدار چند مزعومہ عقائد پر آ کر رہ گیا۔ ایک شخص صرف اس غرور میں کہ الف سے لے کری تک ٹھیک ٹھیک عقائد نفسی کا مجسمہ ہوں تمام مسلمانوں کو حقیر و گمراہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ عمل اور ایثار و محبت فی اللہ کوئی شے نہیں۔ ایک شخص تقویٰ و طہارت میں کتنا ہی اصلح ہو لیکن کسی ایک جزئی و ضمنی عقیدہ میں بھی مخالف ہوا تو اس کی ساری عمر کی کمائی رائیگاں گئی اور باوجود عمر بھر کے ایمان و عمل صالح کے کافر کا فر ہی رہا جس کلمہ کے ایک بار اقرار کر لینے سے ابوسفیان اعدیٰ عدوئے اسلام اور وحشی قاتل حمزہ کا خون حرام ہو گیا تھا اور اگر ابوجہل بھی اقرار کر لیتا تو اس کی ساری عمر کا کفر و طغیان محو ہو جاتا آج ساری عمر اس کے ایمان و عمل میں بسر کر دیجئے لیکن پھر بھی مومنوں کے گروہ میں شمار ہونے کا حق حاصل نہیں کر سکتے افسوس تیرہ سو برس گزر گئے مگر کفر و ایمان کی گتھی آج تک نہ سلجھی۔

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علماء دنیا پرست کبھی ایک جا اکھٹے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایہ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر علم جدل و خلاف ہے نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔ اور چور اور ڈاکو مل جل کر ہرزنی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقان

میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار والفت کی باتیں سننے میں آ جاتی ہیں مگر ہمیں محراب مسجد کے نیچے پیشوائی وامار کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے احبار یہود سے فرمایا تھا۔ تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔

کیا خوب فرمایا ہے کہ خیر الامت حضرت ابن عباسؓ نے ﴿ استمعوا علی العلماء ولا تصدقوا بعضھم علی بعض فوالذی نفسی بیدہ لھم اشد تغیرا من الینوس فی زوبھا وقال بعض الائمة لو خذ بقول العلماء فی کل شی الاقول فی زوبھا وقال بعض الائمہ لوخذ بقول العلماء فی کل شی الا قول بعضھم فی بعض ﴾ حافظ عبدالبر نے کتاب العلم میں یہ اقوال نقل کیے ہیں اور حافظ ذہبی نے قول العلماء ﴿بَعْضُهُمْ فِي بَعْضٍ﴾ پر ایک رسالہ لکھا اور کہا کہ معاصرت سے بڑھ کر علماء کے لیے کوئی ابتلا نہیں۔ ﴿ ولو فتحنا ھذالباب واخذنا بقول المعاصرین بعضھم فی بعض لما مسلم احد من الائمة بل اجل الصحابة والتابعین ﴾ اور یہ بالکل حق ہے امام ابن عبدالسلام کا قول اگر حافظ ابن الصلاح کی نسبت ہم قبول کر لیں۔ اور حافظ ابن الصلاح کا ابن عبد السلام کی نسبت' یا حافظ سیوطی کی رائے حافظ بخاری کی نسبت مان لی جائے اور حافظ بخاری کی سیوطی کی نسبت تو اس کا نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ ہم دونوں سے بدظن ہو جائیں گے حالانکہ دونوں کمال حسن ظن و اعتقاد کے مستحق ہیں۔ بڑے بڑے اعاظم علم و عمل کو اس بارے میں لغزش ہوئی۔ اور ہم کو یقین ہے کہ ان کی خدمات کثیرہ و عظیمہ علم و عمل کے مقابلہ میں یہ لغزش خدا بخش دے گا۔ ہم بے مائگان علم و تہی دستانِ عمل کو زیب نہیں دیتا کہ ان میں سے کسی کی نسبت بھی حرف سو نکالیں۔ یا ان

کے ادب تعظیم میں مضائقہ کریں جنہوں نے اشرفیاں کمائی تھیں۔ انہوں نے ایک مٹھی مٹی کی بھی بھر لی۔ لیکن ہمارے دامن میں بجز گرد و خاک کے اور کیا ہے ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلَا اِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا!﴾

شک اور یقین:

مرض کا ازالہ دوا سے ہو سکتا ہے نہ کہ خود تولید مرض سے اگر دنیا کا اصلی مرض ''یقین'' اور ''بصیرۃ'' سے محرومی ہے۔ اور شک وگمان کی ہلاکت تو اس کا علاج وہ کیوں کر سکتے ہیں جن کا خود اعلان یہ ہے کہ ہمارا منتہائے فکر و ادراک اس سے زیادہ نہیں کہ ﴿لَا اَدْرِیْ وَلَا اَعْلَمُ﴾ ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکے کہ کیا ہے اور کس لیے ہے؟ ﴿بِحُکْمِ شَهِدَ وَاَعْلٰی اَنْفُسِهِمْ﴾ وہ خود اپنے ملتہا معرفت کو جہل سے زیادہ نہیں بتلاتے ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ﴾ معلوم م شد کہ ہیچ معادم نہ شد!

اس کا علاج اور نسخہ شفاء ﴿لِمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ تو صرف اسی اعلم الخلائق و اعرف العباد کے دارالشفاء وحی میں مل سکتا ہے جو شک کی جگہ یقین کا ظلمت کی جگہ نور کا عدم علم کی جگہ علم بصیرت کا ظن وقیاس وگمان کی جگہ بینہ و حجت کا برہان و فرقان کا اور ﴿تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ اور عُرْوَةِ الْوُثْقٰی﴾ کا غرضیکہ ''لا ادری'' اور لا اعلم کی جگہ '' اِنِّیْ اَعْلَمُ'' اور اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ اور اِنِّیْ اَشْهَدُ بلکہ رایت سمعت کا دعوٰی اور اعلان کر رہا ہو اور تمام نوع بشر کو یہ کہہ کر بلا رہا ہو۔ ﴿ هٰذَا سَبِیْلِیْ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰهِ اَعْلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنْ اتَّبَعَنِیْ﴾ اور تمام منکرین و جاحدین سے بار بار مطالبہ کرتا ہو ﴿ هَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ یعنی یہ علم و یقین اور ﴿خُرُوْجَ مِنَ الظُّلُمَاتِ الْجَهْلِ اِلٰی نُوْرِ الْمَعْرُوْفَةِ وَالْحَقِیْقَةِ﴾ کی راہ ہے جس پر میں تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ پھر تمہارے پاس بھی کوئی ''یقین'' اور علم و بصیرۃ ہے جس کو دنیا کے آگے پیش کر سکتے ہو؟ ﴿ فَهَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اور وَهَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ﴾ ایک کہتا ہے کہ میرے پاس شک ہے اگر تم میری طرف آئے تو تم کو شک سے معموم کر دوں گا دوسرا کہتا

ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے بجز یقین اور برہان کے اور کچھ نہیں ﴿ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ رحم سجدہ اور بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ (عنکبوت) میں بصیرۃ ہوں دعوتِ علم ہوں۔ پیام حجت و برہان ہوں۔ حقیقت جو ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک ہی راہ ہوں۔﴿ اقوام الطرق اوضح السبل صراط السوی ان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل تتفرق بکم عن سبیله ﴾ پھر بتاؤ دنیا کو جو طمانت و قرار قلب کی بھوکی اور شک و اضطراب نفس کے زخموں سے جاں بلب ہے کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ اس کا جو خود شک و ریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ایک تاریکی سے نکلنے کے لیے دوسری تاریکی میں ڈوبتا ہے۔ اور تاریکیوں کا یہ حال ہے کہ خود اپنا ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ ایک گتھی سلجھانا چاہتا ہے تو اس نئے الجھاؤ رشتہ ادراک میں پڑ جاتے ہیں کہ ﴿ ظُلُمٰتٌ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَا اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَلَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ؟ ﴾ اور جس کی ان ساری کوششوں اور طلب و جستجو کا جو حقیقت تک پہنچنے اور عقدہ ہستی کو حل کرنے کے لیے کرتا ہے یہ حال ہے کہ ہر نیا مرحلہ ایک نئی گمراہی کا پیام اور ہر منزل ایک نئے بعد و گم گشتگی کی مایوس ہوتی ہے جس نظریہ کو پرکھتا اور جس تھیوری کو فاتح کار سمجھ کر پوجتا ہے جب اس تک پہنچتا ہے تو یقین کی جگہ وہ خود ایک نئے شک کی دعوت نکلتی ہے۔ اور جواب کی جگہ وہ خود ایک نیا سال ہوتی ہے اور اس طرح اس کی ساری امیدیں اور ساری خوشیاں اس پیاسے کی امید سے زیادہ ثابت نہیں ہوتیں جو ریگستان افریقہ کو دجلہ و فرات سمجھ کر بے تحاشا دوڑ رہا ہو۔

یورپ کے پرستار:

سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا شبلی مرحوم وقف علی الاولاد کے لیے علماء کا ایک وفد لے جا رہے تھے۔ اور اسی غرض سے کلکتہ میں مقیم تھے علماء وفد میں ایک بزرگ کہ درس و نظر معقولات کے

لحاظ سے آج کل مخصوص امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ایک دن اسی لب ولہجہ میں جوان بزرگوں کے لیے مخصوص ہے۔آج کل کے انگریزی خواں تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری والہادو بے قیدی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا یہ شکائت کم از کم آپ لوگوں کی زبانی تو اچھی معلوم نہیں ہوتی۔میرے خیال میں تو آپ اور وہ دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب و مسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ آپ کی قدامت واولیت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش وہ یورپ کے پرستار قرآن وسنت سے آپ بھی دور و مہجور وہ بھی بے خبر ونفود

محتسب وانکہ حافظ می خورد واصف ملک سلیمان نیز ہم

بلکہ سچ پوچھئے تو ایک لحاظ سے آپ پر من وجہ فضیلت رکھتے ہیں آپ کے آئمہ و پیشوا فلاسفہ یونان ہیں جن کا قدم ذہنیات خصالہ سے آگے نہ بڑھا۔ان کے معبودانِ علم فلاسفہ یورپ ہیں۔جنہوں نے بہر حال دنیا کے آگے تجربہ واستقراء اور کشفیات عملیہ کا دروازہ کھولا۔ان میں ایک لڑکا جو اسکول کی پانچویں کلاس میں سائینس اور طبیعات کی ریڈر پڑھتا ہے شائد آپ کے مدراس کے ان نہتیوں سے زیادہ صحیح راہ پر ہے۔جو صدرا اور شمش بازغہ سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ صاحبوں میں مترجمین وناقلین عرب تھے جنہوں نے یونانیت کو عربی جامہ پہنا کر مقدس بنادیا اور معتزلہ واخوان الصفاء وغیرہم پیدا ہوگئے جنہوں نے مصطلحات وعبائد یونانیات کو علوم دینیہ میں امتزاج وخلط کیمیائی کے ساتھ ملا دیا۔لیکن ان بیچاروں کو یہ اتفاقات اب تک نصیب نہیں ہوئے۔معاملہ سر سید مرحوم اور ان کے خوشہ چینانِ غیر معترف و مقلدین غیر مقر یا مجتہدین فی المذہب سے آگے نہیں بڑھا ہے۔اگر ان میں بھی کوئی اسی ڈھب کا آدمی نکل آتا تو آپ دیکھتے کہ ان کے مباحث خاصہ آپ کے امور عامہ سے تو ضرور بازی لے جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شک وشبہ کا فتنہ خود اس تیزی سے نہیں آتا جس قدر جلد شک وشبہ کے دور کرنے والے اسے بلا لیتے ہیں ہمیشہ مدعیان تطبیق نقل وعقل ودفع شبہات و شکوک نے ایسا ہی کیا ہے علوم قدیمہ کی اشاعت کے زمانے میں ایک نہایت ہی محدود

جماعت نے یونانی فلسفہ وغیرہ کو پڑھا تھا اور متوسلین دربار خلفاء و مشغولین تراجم ونظر کے علاوہ عام امت اس کے اثرات سے محفوظ تھی سب سے پہلے خود معتزلہ اس کے تیروں سے زخمی ہوئے پھر خود بخود یہ ظاہر کر کے کہ تمام امت زخمی ہوگئی ہے اور اس کا علاج علماء قرآن سنت نہیں کر سکتے۔ اپنے آپ کو خود ساختہ مصلح و معالج قرار دیا۔ اور جس بیماری کا ابھی وجود ہی نہ تھا خود کوشش کر کے اور بلاوے بھیج کر بالآخر اسے بلا ہی لیا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے رو کد اور بحث ونظر نے خواہ مخواہ ہزاروں انسانوں کے عقائد متزلزل کر دیئے عامہ متکلمین وحکما کا بھی یہی حال رہا ہمارے زمانہ میں بھی بعینہ یہی صورت پیش آئی ہے جس پر آج تک کسی نے غور نہیں کیا ابھی نہ تو مسلمانوں میں نئے علوم کی بنا پر کوئی نیا چرچا پھیلا تھا نہ شک وشبہات پیدا ہوئے تھے محض چند لوگ تھے جنہوں نے نہ تو یورپ کی کوئی زبان پڑھی تھی نہ علوم مادیہ سے واقفیت حاصل کی تھی صرف سنی سنائی باتوں اور مقلدانہ جوش عقیدت وحسن ظن یہ یورپ (وجمیع ماغیب الیہ) سے اپنے جی میں شکوک وشبہات پیدا کیے اور پھر خود ہی پکارنا شروع کر دیا کہ علومِ جدیدہ نے اسلام کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے سیلاب نے مسلمانوں کے سیزدہ صد سالہ عقائد زیروزبر کر دیئے اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اسلامی عقائد میں از سرنو ترمیم و تنسیخ کی جائے۔

خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک وشبہات خود تو ابھی نہیں آئے تھے مگر ان لوگوں نے بلاوے بھیج کر بلا ہی لیا۔ اور یہ کہہ کر کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں سچ مچ پوری نسل کو شکوک وشبہات میں غرق کر دیا۔ اگر کہا جائے کہ علاج کیوں کر ہوگا۔ اگر تمام بیماریوں کے حالات منضبط نہ کیے جائیں گے؟ تو جواب یہ ہے کہ تمثیل میں غلطی ہے شبہات بیماری نہیں ہے بد پرہیزی و بے اعتدالی ہے بیماری عدم ایمان ویقین ہے اور وہ ان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے پس بیماریوں کو تو یقیناً معلوم کرنا چاہیے بیماریوں کا کامل علم ہی طبیب کامل کی پہچان ہے۔ لیکن جن بد پرہیزیوں کا بھی ضعفاء صحت کو وہم وگمان بھی نہیں گزرا خود ہی ان کی راہیں پیدا کر کے لوگوں کو بد پرہیزیوں کے نئے نئے دروازے کیوں دکھائے جاتے ہیں؟

مرزائیت

بعض لوگوں کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن جلدِ اول میں یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ مولانا ہر موحد کو قابلِ نجات سمجھتے ہیں خواہ وہ حضرت رسولِ اکرم پر ایمان رکھتا اور آپ کے احکام کو اپنے لیے فرض اور ضروری نہ سمجھتا ہو۔ چنانچہ مولانا نے کہا کہ ایک صاحب کے جواب میں ذیل کا مکتوب ارسال کر کے اس غلط فہمی کو دور فرمایا:۔

اسلام علیکم:۔

خط پہنچا۔ اگر آپ نے ترجمان القرآن کا براہ راست مطالعہ نہ کیا ہوتا اور پھر مجھ سے استفسار کرتے تو میں آپ کو معذور تصوّر کرتا لیکن آپ لکھتے ہیں کہ آپ نے کتاب منگوائی اور اس کا مطالعہ کیا اور پھر بھی اس بارہ میں مضطرب ہیں کہ میرا اعتقاد کیا ہے۔ ایسی حالت میں معاف کیجئے گا۔ اگر میں کہوں کہ یہ صورت حال میرے لیے نا قابل فہم ہے کیا آپ مجھے تحریر کریں گے کہ ترجمان القرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ قرآن کے نزدیک نجات کے لیے ایمان بالرسل ضروری نہیں۔ کم سے کم سورۂ بقر آل عمران' نساء' مائدہ' انعام میں ساٹھ جگہ ایمان بالرسل کا حکم آیا ہوگا۔ کیا آپ کو کوئی مقام ایسا ملا ہے جہاں اس کی یہ تشریح کی گئی ہو کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں اتنا ہی نہیں بلکہ تفسیر سورۃ فاتحہ میں تو خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے۔ کہ قرآن کے نزدیک تفریق بین الرسل کفر ہے یعنی سلسلہ نبوت کی کسی ایک کڑی کا انکار بھی سب کا انکار ہے اور دروازہ نجات بند کر دینا ہے۔ اگر یمان بالرسل ضروری نہیں تو تفریق بین الرسل کیوں کفر ہو میں نہیں سمجھتا آپ حضرات نے ترجمان القرآن کا واقعی مطالعہ بھی کیا ہے یا نہیں محض سنی سنائی باتوں پر بحث کر رہے ہیں۔ نہ صرف ایمان بالرسل بلکہ ایمان بالملائکہ' ایمان بالکتب ایمان بالآخرۃ بھی ضروری

ہے اور جس شخص کو اس سے انکار ہو۔ وہ نجات کی راہ پر نہیں یہ بات ترجمان القرآن میں اس درجہ واضح و آشکارا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ایک بے غرض آدمی اس کے سوا کوئی اور مطلب نکال سکتا ہے باقی رہا ختم نبوت کا سلسلہ تو اس کی بحث کا محل سورۂ فاتحہ نہیں ہے۔ بلکہ سورۃ احزاب ہے تفسیر فاتحہ اس لیے نہیں لکھی گئی ہے کہ عقائد و فقہ کے تمام مسائل جمع کر دیئے جائیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ صرف فاتحہ کی تفسیر مرتب کی جائے۔ بہر حال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ پر اللہ کے رسولوں پر یوم آخرت پر اور قرآن و صاحب قرآن پر ایمان لائے اور عمل سے مقصود وہ اعمال ہیں جنہیں قرآن نے اعمال صالحہ قرار دیا ہے۔ البتہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ تمام گزشتہ رسولوں کی تعلیم یہی رہی ہے۔ اور دین حق ایک سے زیادہ نہیں اگر ایک یہودی حضرت موسیٰ کی سچی تعلیم پر عمل کرنا چاہے گا۔ یا ایک مسیحی حضرت مسیح کی حقیقی تعلیم پر کار بند ہوگا تو اسے ٹھیک ٹھیک یہی راہ اختیار کرنی پڑے گی جو قرآن نے واضح کر دی ہے اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت ہے جو ترجمان القرآن کے بعض مقامات میں واضح کی گئی ہے۔

آپ نے مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا جو خط نقل کیا ہے اس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میرے عقیدہ کی نسبت ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔

غالباً گزشتہ فروری کے اور آخر کی بات ہے کہ ایڈیٹر "انقلاب" نے مجھے اس بارے میں ایک خط لکھا تھا۔ میں نے انہیں وہی جواب دیا جو آپ کو دے رہا ہوں انہوں نے بھی مولوی صاحب موصوف کی کسی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ بعد کو انہوں نے میرا خط چھاپ دیا اور مجھے لکھا کہ مولوی صاحب کو غلط فہمی کا اعتراف ہے لطف کی بات یہ ہے کہ اس اثنا میں دو مرتبہ مولوی صاحب ممدوح کلکتہ آئے اور گھنٹوں مجھ سے یکجائی رہی لیکن انہوں نے اس معاملہ کا ذکر نہیں کیا۔

(ابوالکلام)

کسی صاحب نے مولانا سے دریافت کیا تھا۔ کہ قادنیوں کے اس دعویٰ میں کہاں تک صداقت ہے کہ مسلمانوں کو حضرت مسیح عایہ السلام کے دوبارہ ظہور پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے جو مکتوب ارسال فرمایا وہ درج ذیل ہے۔

۱۹ الف بلی گنج سرکلر روڈ کلکتہ

۱۸ مارچ ۱۹۳۶ء

جی فی اللہ۔ السلام علیکم خط پہنچا آپ دریافت کرتے ہیں احمد فرقہ کے دونوں گروہوں میں سے کونسا گروہ حق پر ہے؟ قادیانی یا لاہوری؟ میرے نزدیک دونوں حق وصواب پر نہیں ہیں۔ البتہ قادیانی گروہ اپنے غار میں بہت دور تک چلا گیا ہے حتیٰ کہ اسلام کے بنیادی عقائد متزلزل ہو گئے ہیں مثلاً اس کا یہ اعتقاد کہ اب ایمان ونجات کے لیے اسلام کے معلوم ومسلم عقائد کافی نہیں مرزا صاحب قادیانی پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن لاہوری گروہ کو اس غلو سے انکار ہے وہ نہ تو مرزا صاحب کی نبوت کا اقرار کرتا ہے نہ ایمان کی شرائط سے کسی نئی شرط کا اضافہ کرتا ہے۔ اسے جو کچھ ٹھوکر لگی ہے۔ اس بے محل اعتقاد میں لگی ہے جو اس نے مرزا صاحب کے لیے پیدا کر لیا ہے۔

باقی رہے مرزا صاحب کے دعاوی تو میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص جس نے اسلام کے اصول ومبادیات کو سمجھا ہے اور عقل سلیم سے بے بہرہ نہیں یہ دعاوی ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتا ہے۔

آپ نے اپنی طبیعت کے اضطراب کا ذکر کیا ہے میں آپ کو ایک موٹی بات لکھتا ہوں اگر غور کیجیے گا تو انشاء اللہ ہر طرح کے اضطراب وشکوک دور ہو جائیں گے۔

آپ دو باتوں پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں؟ ایک یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے دوسری یہ کہ انسان کی نجات کے لیے جن جن باتوں کے ماننے کی ضرورت تھی۔ وہ سب اس نے صاف صاف بتلادی ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی اعتقاد و شرط نجات ہو اور اس نے صاف وصریح نہ بتلا دیا ہو۔

اگر یقین رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ رکھتے ہیں تو غور کیجیے اگر ایک زمانے میں مسلمانوں کے لیے کسی نئے ظہور پر ایمان لانا ضروری تھا تو کیا ضروری نہ تھا کہ قرآن اس کا صاف وصریح حکم دیتا کم از کم اتنی صراحت کے ساتھ جتنی صراحت کے ساتھ ﴿ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُو الزَّکٰوۃَ﴾ کا حکم دیا گیا ہے۔

اچھا قرآن کی ایک ایک آیت دیکھ جائیے کہیں آپ کو یہ حکم ملتا ہے کہ ایک زمانے میں کوئی نیا نبی یا مسیح یا مجدد یا محدث (بالفتح) مبعوث ہوگا۔ اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا۔ کہ اُسے پہچانیں اور ایمان لائیں؟ اگر کوئی ایسا حکم نہیں ملتا تو پھر آپ پر کونسی مصیبت آپڑی ہے کہ بیٹھے بٹھاتے اس جھگڑے میں پڑیں اور ایک نئے ایمان اور نئی شرطِ نجات کے سراغ میں نکلیں۔

اس بارے میں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں تیسری کوئی نہیں یا تو نجات کے لیے وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے صاف صاف بتلا دیئے۔ یا پھر کافی نہیں اگر کافی ہیں تو قرآن نے کہیں یہ حکم نہیں دیا ہے۔ کہ کسی نئے ظہور پر پھر بھی ایمان لاؤ اور اگر کافی نہیں ہیں اور نئے شرائط نجات کی گنجائش باقی ہے تو پھر قرآن ناقص نکلا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے اعلان ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ﴾ میں صادق نہیں۔

ہر مسلمان کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہیں جو راہ چاہے اختیار کرلے اگر قرآن پر ایمان ہے تو نئی شرط نجات کی گنجائش نہیں اگر نئی شرط نجات مانی جاتی ہے تو قرآن اپنی جگہ نہیں رہا۔ ﴿ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ﴾

گزشتہ مکتوب پر سائل نے پھر کچھ خدشات پیش کیے جس پر مولانا نے ذیل کا مکتوب ارسال فرمایا:۔

(ابوالکلامؒ)

۱۹ الف بلی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۵ جون ۱۹۳۶ء

جی فِی اللّٰہِ السلام علیکم خط پہنچا خط میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اُس پر غور کیجئے جو نئے سوالات آپ نے لکھے ہیں۔ان سب کا جواب اس میں آ چکا ہے کسی ایسے سوال کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

جو لوگ کہتے ہیں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ہر صدی کے مجدد پر ایمان لائیں اُن سے پوچھیے کہ یہ حکم کس قرآن میں نازل ہوا ہے؟ اگر قرآن سے مقصود وہ قرآن ہے جو محمد الرسول پر نازل ہوا ہے تو بتایئے کس پارہ، کس سورۃ کس آیت میں یہ بات کہی گئی کہ ______ ہر صدی میں ایک مجدد آئے گا اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کی معرفت حاصل کریں۔اور اس پر ایمان لائیں؟

اگر نہیں کہی گئی ہے تو ہمیں کون سی ضرورت ہے کہ اس لغویت میں پڑیں۔ہم نہیں جانتے مجدد کیا بلا ہوتی ہے؟ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ کی آخری اور کامل ہدایت آ چکی ہے جس کا قرآن ہے اور جس کے مبلغ محمد الرسول تھے۔جو انسان اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کرتا ہے۔اس کے لیے نجات ہے اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہم کو جاننے کی ضرورت ہے۔

جو شخص کہتا ہے کہ نجات وسعادت کے حصول کے لیے یہ کافی نہیں اور کسی مجدد پر بھی ایمان لانا ضروری ہے وہ یا تو اسلام پر بہتان لگاتا ہے یا اسلام کی بو بھی اُس نے نہیں سونگھی ہے۔

باقی رہا نزول مسیح کا معاملہ تو یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے اور اگر کسی زمانے میں

مسلمانوں کی نجات وسعادت اس پر موقوف رہنے والی تھی۔تو ضروری تھا کہ قرآن صاف صاف اسے بیان کر دیتا۔اسی طرح صاف صاف جس طرح اس نے تمام مہمات دینیہ و اعتقادیہ بیان کر دی ہیں۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں کوئی تصریح موجود نہیں۔پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کے اعتقاد پر مجبور ہوں ہمارا اعتقاد ہے کہ اب نہ کوئی بروزی مسیح آنے والا ہے نہ حقیقی قرآن آ چکا ہے اور دین کامل ہو چکا ہے۔

اگر آپ طالب حقیقت ہیں تو ان جھگڑوں میں نہ پڑیئے۔نہ ان خرافات کے بارے میں سوالات کیجئے ہمیں تلاش نجات کی ہے اگر نجات کے لیے قرآن کامل ہے تو پھر وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے بتلا دیئے ہیں زیادہ کاوش میں پڑیں ہی کیوں؟

(ر ۔۔۔الکلام)

گزشتہ خطوط میں ظہور مسیح اور حدیث مجدد پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا اس سے نتیجہ نکالا گیا کہ شائد مولانا آزاد ثناء اللہ صاحب امرتسری نے اپنے اخبار ''اہلحدیث'' میں مولانا کے نام ایک مکتوب مفتوح شائع کیا جس میں مطالبہ کیا کہ مولانا اپنے نظریہ کی وضاحت فرمائیں۔اس کے کواب میں مولانا نے جو مکتوب مدیر اہلحدیث کو ارسال فرمایا وہ تمام وکمال درج ذیل ہے۔

کلکتہ

۱۳ جولائی ۳۶ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ نے ازارہ عنایت ''اہلحدیث'' کا جو پرچہ بھیجا تھا وہ وصول ہوا جو تحریر اس میں شائع فرمائی ہے وہ نظر سے گزری حیران ہوں کہ آخران خطوط میں کونسی بات تھی جس سے ان دوراز کار نتائج کی طرف آپ کا ذہن منتقل ہوا۔ یہ خطوط ایک خاص شخص کے خاص استفسار کے جواب میں لکھے گئے ہیں اور ضروری ہے۔کہ اسے پیش نظر رکھا جائے مستفسر نے لکھا تھا۔کہ ایک عرصہ سے بعض احمدی مبلغ قادیانی طریقہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں نے کئی صاحبوں سے استفسار کیا لیکن جوابات سے ردوکد کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے دل کا کانٹا نکلتا نہیں جو بات سب سے زیادہ مضطرب کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ ایمان ونجات کا ہے۔اگر واقعی کسی نئے ظہور پر ایمان لانا ضروری ہو اور میں انہی بحثوں میں رہ جاؤں تو کل کو میرا کیا حشر ہوگا؟ میں نے اس کے جواب میں ایک ایسی موٹی سی بات لکھ دی جو مخاطب کے اوغان ورفع واضطراب کے لیے قاطع اور مختتم ہو سکتی ہے۔اور جس فہم کے لے نہ تو اصول ومقدمات کی ضرورت ہے نہ علم وفن کی استعداد کی ایک لمحہ میں ساری ردِوکد ختم ہو جاتی ہے میں نے لکھا کہ اتنی بات مانتے ہو یا نہیں کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور جن باتوں پر ایمان لانا شرطِ اسلام ونجات ہے وہ اس نے بتلا دیئے ہیں۔اچھا کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں قرآن کا

کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھ لو کہیں یہ حکم پاتے ہو کہ آئندہ ایک زمانہ میں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بے سود ہو جائے گا اور ایک نئے ظہور پر ایمالانا پڑے گا یا کسی زمانے میں اسلام کی پچھلی شہادتیں بے کار ہو جائیں گی۔ اور ایک تیسری شہادت کا اضافہ ہو جائے گا مثلاً ایمان بالمجدد؟ اگر نہیں پاتے ہو تو کونسی مصیبت آ پڑی ہے کہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو۔ اور ایمان ونجات کی طرف سے مضطرب ہوتے ہو۔

بلاشبہ اس تخاطب میں میں نے صرف قرآن کا ذکر کیا۔ احادیث کا ذکر نہیں کیا۔ مگر اس لیے نہیں کہ مخاطب کے لیے اتنا ہی کہنا قاطع و فیصلہ کن تھا ورنہ ظاہر ہے کہ احادیث میں بھی کہیں یہ بات نہیں آئی ہے کہ آئندہ اسلام کے شرائط ایمان میں ایک نئی شرط بڑھ جائے گی۔ اور نئے رسول پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔

اب فرمایئے اگر ایسا لکھ دیا گیا تو اس میں کونسی برائی کی بات ہوگئی جو اس درجہ ناگواری خاطر کا موجب ہو رہی ہے کیا قرآن کا حوالہ دینا انکار حدیث کے لیے مستلزم ہے۔ کیا احادیث میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ نئے نئے ظہوروں پر ایمان باللہ وایمان بالرسول کی طرح ایمان لاتے رہنا۔

اس کے بعد مستفسر نے اپنے مبلغ دوست کا قول نقل کیا کہ مسلمانوں کو ہر صدی کے مجدد پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اعلیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بہ حیثیت رسول کے آئیں گے اور انہی کے ہاتھوں اس دین کی تکمیل ہوگی میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلامی عقائد میں کسی ایسے مجدد کی جگہ نہیں جس پر ایمان بالرسول کی طرح ایمان لاتے رہنے کا حکم دیا گیا ہو باقی رہا نزول مسیح کا معاملہ تو شرائطِ ایمان کی ترمیم و تنسیخ کا معاملہ نہایت اہم اور اساسی معاملہ ہے اگر مسلمانوں کی نجات کسی نئے ایمان پر موقوف رہنے والی ہوتی تو ضروری تھا کہ اس کا صاف صاف حکم دیدیا جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ پس ہمارا عقیدہ یہی ہونا چاہیے کہ دین کامل ہو چکا۔ آخری کتاب نازل ہو چکی (اور اب تکمیل دین کے لیے نہ کسی بروزی مسیح کی گنجائش ہے نہ حقیقی مسیح کی)

یہ ظاہر ہے کہ اس عبارت میں جو نفی کی گئی ہے وہ کسی ایسے نزول کی کی گئی ہے جو

دین کی تکمیل کے لیے ہوگا۔ اور بہ حیثیت رسول کے ہوگا نہ کہ نفسِ نزول کی۔

چنانچہ سیاق وسباق اس کی صاف شہادت دے رہا ہے اس سے اوپر مجدّد کی نفی کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہاں بھی مقصود کوئی ایسی تجدید نہیں ہے جس پر ایمان لانا مثل ایمان بالرسل کے ضروری ہو۔ ورنہ حدیث میں یجدّد دلھا دینھا مجدد یعنی مصلحین حق پیدا ہو چکے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ ﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ غَالِبُوْنَ﴾

بلاشبہ روایات میں نزولِ مسیح علیہ السلام کی خبر دی گئی ہے اور صحیحین کی روایت اس باب میں معلوم ومشہور ہیں۔ اس سے کسے انکار ہے لیکن اس معاملہ کا تعلق قیامت کے آثار ومقدمات سے ہے نہ کہ تکمیل دین کے معاملہ سے نیز انہی روایات میں تصریحات موجود ہیں۔ کہ حضرت مسیح کا نزول بہ حیثیت رسول کے نہیں ہوگا میں سمجھتا ہوں۔ اس تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ یہی رہا ہے کہ دین ناقص نہیں۔ اور اپنے تکمیل کے لیے کسی نئے ظہور کا محتاج نہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؟

آپ پوچھتے ہیں احادیث کے بارے میں میرا عقیدہ کیا ہے؟ میں اس کا آپ کو کیا جواب دوں کہ آپ کو میرے عقیدہ کی خبر نہیں؟ کیا آپ کی نظر سے میری بے شمار تحریرات نہیں گزر چکی ہیں؟ یہ سوال آپ اس شخص سے کر رہے ہیں جو اپنی تحریرات میں نہ صرف حدیث کو حجت اور واجب العمل ثابت کر چکا ہے۔ بلکہ جس کو اس فہم کی توفیق ملی ہے کہ ﴿وَلِیُعَلِّمَھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ﴾ میں ''حکمت'' سے مقصود ''سنت'' ہے اور جس نے جابجا مقدام کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ ﴿اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ﴾ نیز روایت مشہورہ ﴿یوشک رجل شبعان علیٰ اریکتہ بقول علیکم بھذا القران فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما جدتم فیہ من حرام فحرموہ﴾

اتنا ہی نہیں بلکہ جس کی تمام قلمی جدوجہد یکسر دعوت اتباع کتاب وسنت پر مبنی رہی ہے۔ اور جس کے عقیدہ میں کتاب کا ہر وہ اتباع اتباع نہیں جو ''سنت کے اتباع سے خالی ہو۔

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

یہ ظاہر ہے کہ میں ایک شخص کے استفسار کا جواب لکھ رہا تھا۔ کوئی تصنیف نہیں

کررہا تھا۔ اس طرح کے سوالات روز لوگ کرتے رہتے ہیں اور کم سے کم جملوں میں جو جواب دے سکتا ہوں دیدیا کرتا ہوں اسی استفسار کا جواب سینکڑوں آدمیوں کو دیا ہوگا ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے اور چاہیے اسی محل میں رہ کر اس پر غور کیا جائے۔ پھر خصوصاً اگر تحریر کسی ایسے شخص کی ہو جس کے عقائد و مسلک سے ہم ناواقف نہیں۔ تو اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہی مطلب ٹھہرائیں جو اس کے عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔

اہلِ حق و دانش کا طریقہ جو ہمیں بتلایا گیا ہے۔ وہ تو یہ ہے کہ ﴿يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

یہاں تک تو آپ کے استفسار کا جواب تھا۔ اب ایک دو لطیفے بھی سن لیجئے آپ نے لکھا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر مجھے اس کا جواب دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ نے رائے قائم نہیں کی ہے میرے جواب کا انتظار ہے لیکن مضمون کی سرخی میں آپ نے ازراہ عنایت تنابز بالالقاب کے ساتھ میرا نام درج کر دیا ہے گویا جزم و یقین کے ساتھ فیصلہ کر لیا لطیفہ یہ ہے کہ:۔

اگر فیصلہ ہو چکا تھا تو پھر استفسار کیوں؟ اور اگر استفسار ہے تو پھر یہ تنابز بالالقاب کیوں؟

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ:۔

خطوط میرے تھے استفسار مجھ سے کرنا ہے لیکن مضمون اخبار میں شائع کرتے ہیں۔ اور پھر اس کا پرچہ ڈاک کے ذریعہ بھیج دیتے ہیں سوال یہ ہے کہ جس ڈاک کے ذریعہ آپ کا اخبار مجھے مل سکتا ہے اسی ڈاک کے ذریعہ آپ کا خط مجھے نہیں مل جاتا؟ شائد آپ نے خیال کیا کہ خط بھیجنے کا زیادہ محفوظ ذریعہ یہی ہے کہ اخبار میں چھاپ دیا جائے۔ خیر پرچہ از دوست میرسد نیکوست امید ہے کہ مع الخیر ہوں گے۔

(ابوالکلام)

اسی سلسلہ میں ایک اور صاحب کے جواب میں مولانا نے جو مکتوب تحریر فرمایا۔وہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عزیزی۔السلام علیکم:۔آپ نے اخبار کا جو پرچہ بھیجا ہے میں نے دیکھا جن صاحب نے میرے یہ خطوط شائع کئے ہیں اگر وہ ان کے ساتھ اپنے خطوط بھی شائع کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔اس طرح جواب کی نوعیت پوری طرح واضح ہو جاتی جس عبارت کی نسبت آپ دریافت کرتے ہیں۔وہ دراصل ان کے ایک خاص سوال کے جواب میں لکھی گئی ہے انہوں نے لکھا تھا کہ احمدی جماعت کے مبلغ کہتے ہیں۔

ہمیں حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ ظہور پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور دین کی تکمیل انہی کے ہاتھوں ظہور میں آئے گی۔

میں جواب میں لکھا کہ:۔

یہ صحیح نہیں اگر کسی زمانہ میں مسلمانوں کے لیے یہ بات ضروری ہونے والی تھی کہ کسی نئے ظہور پر ایمان لائیں اور دو شہادتوں پر ایک تیسری شہادت کا اضافہ ہو جائے تو ضروری تھا کہ اس کا انہیں صاف صاف حکم دیا جاتا۔

لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے پس معلوم ہوا کہ اب تکمیل دین کے لیے نہ کسی بروزی مسیح کی ضرورت ہے نہ حقیقی مسیح کی۔قرآن آچکا اور دین کا معاملہ کامل ہو چکا۔پس اس عبارت کا مطلب یہ ہوا۔کہ روایات میں جس نزول مسیح کی خبر دی گئی ہے۔اس کا تعلق قیامت کے آثار و مقدمات سے ہے۔دین کی تکمیل سے نہیں ہے کہ حضرت مسیح بہ حیثیت ایک نبی کے نازل ہوں گے اور ہر مسلمان کے لیے ضروری ہوگا کہ نبوت کے ایک نئے ظہور پر ایمان لائے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ بہ سلسلہ آثار قیامت نزول مسیح کی جو خبر دے گئی ہے۔اس کی نفی کی جائے چنانچہ عبارت مسئولہ عنہا کا بغور مطالعہ کیجئے سارا زور تکمیل دین اور شرائط

ایمان ونجات کے معاملہ پر پڑ رہا ہے۔

اور جو کچھ نفی کی گئی ہے۔اس کی کی گئی ہے عبارت کے الفاظ یہ ہیں۔

اگر کسی زمانہ میں مسلمانوں کی نجات وسعادت اس پر موقوف رہنے والی تھی تو ضروری تھا کہ قرآن صاف صاف اسے بیان کر دیتا۔اسی طرح صاف صاف جس طرح تمام مہمات اعتقادیہ کردی ہیں۔

یعنی نزول مسیح کی خبر محض آثار وقیامت کے سلسلہ میں دی گئی ہے مسلمانوں کی نجات وسعادت کے معاملہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر ہوتا تو اس کا ہمیں حکم دیا جاتا پس اب تکمیل دین کے لیے نہ تو کوئی بروزی مسیح آنے والا ہے نہ حقیقی۔

(ابوالکلام)

خراج عقیدت

☆ ہم ان کے دماغ کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے۔

(پنڈت نہرو)

☆ ابوالکلام کی سی عظمت کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

(راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند)

☆ مرحوم استقامت کے پہاڑ اور فراست کا سمندر تھے۔

(رادھا کرشنن)

☆ وہ گاندھی جی سے بھی پہلے سیاسیات کے کوچے میں آ گئے تھے۔

(ڈھیبر صدر کانگرس)

☆ وہ تاریخی شخصیت نہیں تاریخ کا ایک عہد تھے۔

(اچاریہ کرپلانی)

☆ وہ ملک کا ضمیر تھے ان کا دماغ روشن اور دل آئینہ تھا۔

(ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار)

☆ وہ عظیم راہنما تھے۔ وہ اسلام کی بولتی ہوئی تصویر تھے۔

(آرونا آصف علی)

☆ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے

(شورش کاشمیری)

☆ ہندوستان سے برطانوی سامراجیوں کو نکال باہر کرنے کا سہرا مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں کے سر ہے۔

(خان عبدالغفار خاں)

☆ مرحوم ایک بے مثال خطیب اور جدوجہدِ آزادی کے زبردست مجاہد تھے۔

(میاں افتخار الدین)

☆ آج مجھے خلافت کا وہ دور یاد آ رہا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شاندار دور تھا۔

(چودھری خلیق الزماں)

☆ مرحوم تاریخِ عالم کے ایک عظیم شخصیت تھے۔

(مولانا احتشام الحق تھانوی)

☆ مولانا کی وفات سے ہندوستان ایک قابل ترین منتظم اور تجربہ کار سیاستدان سے محروم ہو گیا ہے۔

(حمید الحق چودھری)

☆ دنیائے تعلیم کے لئے ان کی رحلت ایک بین الاقوامی نقصان ہے۔

(میر علی خاں احمد خاں تالپور)

☆ ان کی وفات سے پاکستان ایک دوست اور ایک حقیقی دوست سے محروم ہو گیا ہے۔

(عبدالصمد اچکزئی)

☆ مولانا کی وفات ایک متبحر عالم اور عرب و ہندو دوستی کے آرزومند کی موت ہے۔

(شیخ بکرین)

☆ مولانا آزاد کی وفات سے صرف ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ مشرق قریب اور وسطی کے تمام ملکوں کا نقصان ہے۔

(فواد ساوق وزیر خارجہ ترکی)

☆ ان کی وفات نے ہندوستان اور تمام دنیائے اسلام کو ایک عظیم شخصیت اور جید عالم سے محروم

(قاسم گولیک جنرل سیکرٹری میلکن پارٹی ترکی)
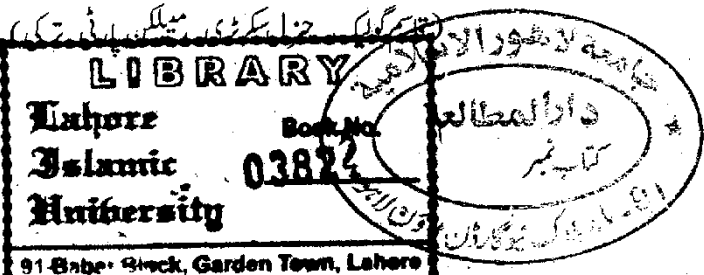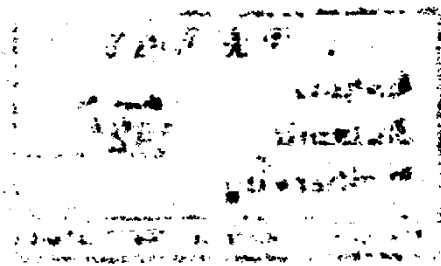
مولانا ابوالکلام آزاد کی دیگر کتب

کتاب	مصنف
تفسیر ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد
غبار خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد
تحریک آزادی	مولانا ابوالکلام آزاد
اسلام اور جمہوریت	مولانا ابوالکلام آزاد
حقیقت الصلوٰۃ	مولانا ابوالکلام آزاد
اُمّ الکتاب	مولانا ابوالکلام آزاد
مسئلہ خلافت	مولانا ابوالکلام آزاد
ولادت نبوی ﷺ	مولانا ابوالکلام آزاد
حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے آخری لمحات	مولانا ابوالکلام آزاد
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد
امر بالمعروف	مولانا ابوالکلام آزاد
آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا۔	مولانا ابوالکلام آزاد
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد
خطبات آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد
آزادی ہند	مولانا ابوالکلام آزاد
خودنوشت	مولانا ابوالکلام آزاد

طیب پبلشرز

5 یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7241778